بانی : حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر : خالد سیف اللہ رحمانی

سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۱۱۵-۱۱۶ / ۱۵-۱۶	جنوری — جون ۲۰۱۹ء	جمادی الاولیٰ — شوال ۱۴۴۰ھ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

زرِتعاون

اندرون ملک	بیرونِ ملک
ایک شمارہ:40روپے	ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ:20امریکی ڈالر
سالانہ:150، بذریعہ رجسٹری:200	یورپ،امریکہ،افریقہ کے لئے :
سہ سالہ:450، بذریعہ رجسٹری:550	سالانہ:30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd. A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک/ ڈرافٹ پر صرف:"Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر:9959897621 91+

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

یوں تو عالم اسلام اور خود برصغیر میں بہت سی دینی تحریکیں وجود میں آئیں، انھوں نے اپنے اپنے میدان میں مفید خدمتیں بھی انجام دیں، اور گہرے اثرات بھی ڈالے؛ لیکن اسلام کا تحفظ اور دین برحق سے مسلمانوں کے تعلق کو باقی رکھنے میں تحریک مدارس کا حصہ سب سے نمایاں رہا ہے اور خاص کر مغلیہ حکومت کے خاتمے کے باوجود جس چیز نے برصغیر کو اسپین بننے سے بچائے رکھا، وہ یہی مدارس ہیں، یہ تحریک بارونق شہروں سے لے کر دُور دراز دیہاتوں اور قریوں تک پھیل گئی، اور مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کے لئے سرگرم عمل رہی، اسی کا اثر ہے کہ ایک غیر مسلم اکثریت ملک ہونے کے باوجود دینی شعائر کا جو احترام و اہتمام اس خطہ میں ہے، شاید ہی کسی اور علاقے میں ہو۔

ان مدارس کا مقصد صرف تعلیم و تعلم نہیں ہے، اور ان کی منزل محض روایتی اقدار کو باقی رکھنا اور تعلیم کے اس قدیم نظام کو جوں کا توں جاری رکھنا نہیں ہے، جو گزشتہ تقریباً پونے دوسو سال سے چلا آرہا ہے؛ بلکہ زمانے کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھانا ہے، زمانے سے ہم آہنگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغرب سے آنے والی ہر رطب و یابس کو قبول کرلیا جائے؛ بلکہ عصری ہم آہنگی سے یہ مراد ہے کہ مدارس کے فضلاء اپنے عہد کے افکار سے واقف ہوں، اسلام کے خلاف اُٹھائے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے اہل ہوں، شریعت اسلامی کی برتری اور اس کے اندر انسانی ضرورت و مصلحت کی پوری پوری رعایت کو سمجھانے پر قادر ہوں، نیز سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی بناء پر جو نئے مسائل پیدا ہورہے ہیں، شرعی نقطۂ نظر سے ان کو حل کرسکتے ہوں۔

دینی مدارس کو اس سمت میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے نصابِ تعلیم میں بعض مضامین کو بڑھانے کی بھی ضرورت پڑے گی اور اس سے بھی زیادہ تربیت کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، تربیت کے نام پر ہمارے مدارس میں عموماً صرف اخلاقی تربیت دی جاتی ہے، یہ یقیناً بہت ضروری ہے اور اسی سے انسان کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ لیکن یہ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ فکری تربیت بھی ضروری ہے؛ تاکہ وہ اپنے زمانے

کے افکار و احوال اور طریقۂ استدلال سے واقف ہوں اور مخالف سوچ رکھنے والوں کی طرف سے مذاکرات کا سلیقہ ان کے اندر پیدا ہو۔

المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی بنیاد اسی مقصد کے تحت رکھی گئی ہے کہ کچھ ایسے باصلاحیت فضلاء تیار ہوں جو ان صلاحیتوں سے آراستہ ہوں، اسی مقصد کے تحت تفسیر، حدیث، فقہ اسلامی، اسلامک فائنانس، انگریزی زبان، مطالعہ مذاہب وغیرہ کے شعبے قائم کئے گئے، انگریزی زبان، کمپیوٹر، دستور ہند میں سے بنیادی حقوق، مختصر تاریخ ہند اور مبادیٔ معاشیات، کو تمام شعبوں میں ایک ضروری مضمون کی حیثیت سے شامل رکھا گیا ہے، ۲۰۱۷ء میں معہد نے ایک نیا قدم اُٹھاتے ہوئے تاہیل القیادۃ (Leadership Devolepment) کا شعبہ قائم کرنے کے سلسلے میں ایک اہم مشاورتی نشست رکھی تھی، جس میں شمالی وجنوبی ہند سے چند اہم علماء و دانشوروں کو مدعو کیا گیا اور اس شعبے کی اہمیت نیز اس کے نصاب پر گفتگو کی گئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت اسلام پر جس طرح حملہ کیا جا رہا ہے، اور شریعت اسلامی کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ضروری ہے کہ انگریزی زبان پر قدرت رکھنے والے علماء کی ایک ٹیم تیار کی جائے، جو نئی نسل کو مخاطب بنا سکے، میڈیا میں پہنچ کر گفتگو کر سکے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُٹھائے جانے والے سوالات کے جواب دے سکے؛ چنانچہ اسی نشست میں شعبے کا بنیادی نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، جو آٹھ اہم مضامین پر مشتمل ہے، اور اس میں پانچ فضلاء کا داخلہ لیا گیا، جنھوں نے کسی دینی درس گاہ سے فضیلت کے بعد اسلامی موضوعات میں سے کسی موضوع پر تخصص بھی کیا تھا، اور انھوں نے انٹر یا اس کے مساوی عصری تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی، نیز وہ جس علاقے کے رہنے والے ہیں، وہاں کی مقامی زبان سے بھی واقف تھے اور اس میں تقریر و تحریر کی صلاحیت رکھتے تھے۔

بحمد اللہ ان پانچ میں سے تین فضلاء نے سال مکمل کیا اور حوصلہ افزا نتیجہ سامنے آیا، مؤرخہ: ۹/اپریل ۲۰۱۹ء، مطابق: ۱۰/شعبان ۱۴۴۰ھ کو جب معہد کے پارک میں ان کا ایک پروگرام رکھا گیا تو شعبہ انگریزی، مطالعہ مذاہب اور شعبہ تربیت قیادت کے طلبہ نے پورا پروگرام انگریزی زبان میں پیش کیا، جو عصری معلومات سے بھرپور تھا، اور جس میں خود طلبہ نے پاور پوائنٹ پرزنٹیشن تیار کیا اور نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ اپنی بات پیش کی، ماشاء اللہ تمام ہی شرکاء نشست کی زبان پر تحسین و آفرین کے کلمات تھے، اور سبھی حضرات کا خیال تھا کہ مدارس اسلامیہ کی دنیا میں یہ ایک منفرد کوشش ہے، معہد نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے شوال ۱۴۴۰ھ میں دس فضلاء کا داخلہ لینے کا فیصلہ کیا ہے؛ تاکہ عصر حاضر کی ضرورت پوری کرنے کی صلاحیت رکھنے والے فضلاء کی ایک ٹیم

تیار ہو جائے، جو موجودہ حالات کے پس منظر میں اسلام کا فریضہ انجام دے سکے، اگر آئندہ پانچ سالوں میں ایسے پچاس فضلاء تیار ہو جائیں تو انشاء اللہ یہ ملتِ اسلامیہ کے لئے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوں گے۔

ادھر گزشتہ چند سالوں سے شریعت اسلامی کو مجروح کرنے کے لئے عدالتوں کا سہارا لیا جارہا ہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور جمعیۃ علماء ہند قانونی سطح پر مدافعت کا کام کررہی ہے، اس موقع پر شدت سے یہ بات محسوس کی گئی کہ ایسے وکلاء کی بے حد کمی ہے، جو کما حقہ اسلامی تعلیمات اور قانون شریعت سے واقف ہوں، ایسے وکلاء کی مسلمانوں کو درپیش مسائل اور شریعت کے خلاف دائر کئے جانے والے مقدمات میں اسلام کی ترجمانی کے لئے سخت ضرورت ہے، اس پہلو سے معہد نے شاہین گروپ آف اسکولس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے، جیسے یہ گروپ حافظ پلس کا شعبہ چلاتا ہے، اسی طرح عالم پلس کا شعبہ شروع کرے، جس کا ہدف علماء کو لاء میں داخلہ کے لئے تیار کرنا ہے، اس شعبہ میں کسی مستند دینی درسگاہ کے فاضل کا داخلہ ہوگا، اور یہ تین مرحلوں پر مشتمل ہوگا، پہلا مرحلہ ایک سال کا ہوگا، جس میں انھیں دسویں کلاس کا امتحان دلایا جائے گا، دوسرا مرحلہ انٹرمیڈیٹ کا ہوگا، جس میں انھیں انٹر کے ساتھ ساتھ لاء میں داخلہ کے لئے تیار کیا جائے گا، تیسرا مرحلہ لاء کالج میں داخلہ کا ہوگا، پوری مدت تعلیم میں ان کو پانچ ہزار کا خصوصی وظیفہ دیا جائے گا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد دو سال تک انھیں پندرہ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا؛ تاکہ وہ سیٹ ہو جائیں اور پھر آئندہ ان سے مسلمانوں کے مفاد اور اسلام کی ترجمانی کا کام لیا جاسکے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ماہ مبارک میں معہد کے اِن اہداف کی کامیابی کے لئے دُعا فرمائیں کہ انسان کا کام کوشش کرنا ہے، اور کسی کوشش کا کامیاب ہونا اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد پر موقوف ہے۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

۵ / رمضان ۱۴۴۰ھ
۱۱ / مئی ۲۰۱۹ء

• • •

چند سرکاری وغیر سرکاری منفعت بخش اسکیمیں اوران کا حکم شرعی

سوالات از : ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند

جوابات از : خالد سیف اللہ رحمانی

سوال نامہ (۱)

مختلف سرکاری یا غیر سرکاری ادارے (مثلاً: بینک، کمپنیاں وغیرہ) پسماندہ طبقات کے فائدے یا رفاہِ عام اور انسانی ہمدردی کے جذبہ سے مختلف قسم کی اسکیمیں جاری کرتے ہیں، جن کے ذریعہ تعلیم، صحت، علاج، مکان، تجارت اور زراعت وغیرہ کے میدان میں عام آدمی کو کسی قدر فائدہ بھی پہنچتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس طرح کی اسکیموں کا بغور جائزہ لے کر اُن کا شرعی حکم بیان کیا جائے؛ تاکہ جو حضرات اس نظام سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، اُن کے سامنے اصل صورتِ حال واضح ہو سکے۔

اسی لئے ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' جمعیۃ علماء ہند، علماء اور مفتیانِ کرام کو اس قسم کی چند مروجہ اسکیموں کے بارے میں غور وفکر کی دعوت پیش کرتا ہے، اُمید ہے کہ تنقیح وتحقیق کے بعد حکم شرعی واضح کیا جائے گا۔

اسی مقصد سے چند سوالات پیش خدمت ہیں :

۱- بچیوں کی پیدائش پر تعاون کی اسکیم

(الف) حکومت نے لڑکی کی پیدائش کے متعلق ایک اسکیم بنائی ہے، جس کے تحت بچی کی پیدائش پر متعلقہ محکمہ سے فارم کی خانہ پوری کے بعد حکومت اُس لڑکی کے نام پر بینک میں دس ہزار روپئے جمع کرتی ہے اور پندرہ سال پورے ہونے پر لڑکی کے کھاتے میں حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپئے جمع کر دیئے جاتے ہیں، درمیان میں لڑکی یا اس کے والدین کی طرف سے کچھ جمع کرنا نہیں پڑتا، تو سوال یہ ہے کہ کیا اولاً جمع کئے جانے والے صرف دس ہزار روپے کو حکومت کا انعام مانا جائے اور پندرہ سال بعد اس دس کی جگہ ایک لاکھ کو سود قرار دیا جائے؟ یا پوری رقم کو سرکاری تعاون قرار دے کر اُس سے انتفاع کو حلال قرار دیا جائے؟ جو بھی شکل راجح ہو، اُسے مدلل تحریر فرمائیں۔

(ب) بچیوں کی پیدائش کے سلسلہ میں بعض صوبوں میں اِس طرح کی اسکیم بھی جاری کی گئی ہے کہ بچی کی پیدائش پر اُس کے نام سے بینک میں کھاتہ کھول کر ہر ماہ کچھ رقم جمع کرائی جاتی ہے (مثلاً: پانچ سو یا ہزار روپے) پھر جب لڑکی اٹھارہ سال کی ہوجاتی ہے تو جمع شدہ رقم کی تین گنی مقدار حکومت کی طرف سے اس کے کھاتے میں جمع کردی جاتی ہے، (مثلاً: اگر دو لاکھ روپئے جمع ہوئے تو چھ لاکھ روپئے حکومت جمع کرائے گی) تو سوال یہ ہے کہ یہ اضافی رقم سود کے دائرہ میں داخل ہوگی یا حکومتی تعاون کہلائی جائے گی؟ اور اس طرح کی اسکیم سے مسلمانوں کو فائدہ اُٹھانا جائز ہے یا نہیں؟

۲- بے روزگار نوجوانوں کے لئے تعاون کی اسکیم

حکومت کی طرف سے بطور خاص اقلیت اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے بے روزگار نوجوانوں کے لئے ایک اسکیم شروع کی گئی ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ حکومت طلب گار کو حسب شرائط مثلاً ایک لاکھ روپے دیتی ہے، جس میں سے ۸۰/ ہزار روپئے بطور تعاون دیئے جاتے ہیں، جن کی واپسی کا مطالبہ نہیں ہوتا اور ۲۰/ ہزار روپئے بطور قرض ہوتے ہیں، جن کو حکومت بعد میں واپس لیتی ہے، اور اس ۲۰/ ہزار روپئے پر حسب ضابطہ سود بھی لیتی ہے، یعنی اس رقم کی واپسی میں جتنی تاخیر ہوگی، اتنی ہی اُس پر سودی رقم بڑھتی چلی جائے گی، کیا ایک مسلمان کے لئے اس اسکیم سے فائدہ اُٹھانا جائز ہوگا؟

۳- اعلیٰ تعلیم کے لئے آسان شرطوں پر قرض کی اسکیم

اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے حکومت بینک سے طالب علم کو قرض دلاتی ہے اور دورانِ تعلیم، اس قرض پر جو سود عائد ہوتا ہے، وہ حکومت اپنی جانب سے ادا کرتی ہے، طالب علم کو ادا نہیں کرنا پڑتا؛ البتہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس رقم کی ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوگی، اس کا سود طالب علم کو خود دینا ہوگا، اس طرح کی اسکیم سے مسلم طلبہ کے استفادہ کا کیا حکم ہے؟

۴- تعلیم کے فروغ کے لئے بینک کی طرف سے جاری کردہ ایک اسکیم

''ایکسس بینک'' (Axis Bank) نے تعلیم کے فروغ کے مقصد سے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بچے کا والد اپنے نابالغ بچے کی طرف سے پانچ سال تک بینک میں ایک لاکھ روپئے سالانہ جمع کرے، جب پانچ سال کی مدت پوری ہوجائے تو آگے جتنی مدت تک بینک میں اس پیسے کو چھوڑے رکھے گا، اس کو غیر متعینہ نفع ملتا رہے گا، جو کم بھی ہوسکتا ہے اور زیادہ بھی؛ البتہ اس میں نقصان کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، تو اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اُٹھانا درست ہے یا نہیں؟

۵- مویشی پالن اسکیم

سرکار مویشیوں کو خریدنے کے لئے کسی شخص کو مدد کی غرض سے مثلاً دس لاکھ روپئے دیتی ہے اور پھر ان دس لاکھ روپئے میں سے صرف پانچ لاکھ روپئے واپس لیتی ہے، حتیٰ کہ اگر اِس رقم سے خریدے ہوئے جانوروں میں کوئی جانور مر جائے تو مطالبہ پر اُس کی رقم حکومت کی طرف سے دوبارہ دی جاتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کی اسکیم سے فائدہ اُٹھانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو اس معاملہ کو شریعت کے کس اُصول کے تحت رکھا جائے گا؟

۶- ایکسپورٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے ''ڈرابیک'' پالیسی

ایک شخص ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا ہے، سرکار ہر مصنوعات ایکسپورٹ کرنے پر الگ الگ فیصد کے حساب سے ڈرابیک (واپسی اضافی رقم) دیتی ہے، جیسے: ایک آدمی نے پیاز ایکسپورٹ کی، تو سرکار اس ایکسپورٹ کردہ پیاز کی قیمت کا تین فیصد اپنی جانب سے ایکسپورٹر کو دیتی ہے، تو کیا اس اسکیم سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؟ اور سرکار کی طرف سے دی جانے والی رقم کو کس زمرہ میں رکھا جائے گا؟

۷- ڈیبٹ کارڈ استعمال کرنے پر منافع کی اسکیم

''اسٹیٹ بینک آف انڈیا'' (SBI) اپنے صارفین کو یہ اسکیم دیتی ہے کہ اگر صارف اس کا ''ڈیبٹ کارڈ'' استعمال کر کے کچھ خریداری کرے تو وہ پانچ فیصد نقد واپس کرتی ہے، مثلاً کوئی شخص ۱۵ر ہزار کا سامان ''ڈیبٹ کارڈ'' سے خریدے تو بینک پانچ فیصد کے حساب ساڑھے سات سو روپئے واپس کرتی ہے، تو شرعاً اس واپس شدہ رقم لینے کا کیا حکم ہے؟

سوال نامہ (۲)

انٹرنیٹ کے ذریعہ لین دین وغیرہ کی چند جدید شکلیں

انٹرنیٹ کے کاروبار کو ''اِی بزنس'' (E- Business) یا ''اِی کامرس'' (E- Commerce) کہا جاتا ہے، انٹرنیٹ کی سہولت سے استفادہ کا ایک بڑا حصہ اس وقت کاروباری اور تاجر طبقے سے وابستہ ہے، بے شمار مصنوعات اب انٹرنیٹ پر بیچی اور خریدی جاسکتی ہیں اور مختلف قسم کے تجارتی معاملات اس پر انجام دیئے جارہے ہیں، ای بزنس بنیادی طور پر ایک آسان، کم خرچ اور کم وقت والی تجارت ہے، اس کاروبار کے لئے اب ذاتی ویب

سائٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ بہت سی ویب سائٹس اپنے واسطے سے خرید وفروخت کا موقع دیتی ہیں، ان کے ذریعہ خدمات بھی فراہم کی جاسکتی ہیں، اس وقت انٹرنیٹ پر مختلف قسم کے پروگرام بھی ایجاد کئے جاسکتے ہیں، جن سے متنوع سہولیات حاصل کی جاسکتی ہیں اور مختلف قسم کے کاروبار بھی کئے جاسکتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ یہ ایک وسیع اور مختلف الجہاد موضوع ہے، ساری شکلوں کا احاطہ کرنا دشوار ہے، اس لئے بعض ماہرین فن کے تعاون سے چند مشہور اور مروجہ شکلوں کا تعارف اور اُن کی تفصیلات پیش کی جارہی ہیں؛ تاکہ حکم شرعی کی تنقیح ہوسکے۔

آن لائن اشہارات کے ذریعہ کمائی

آج کل انٹرنیٹ پر اشتہارات کے ذریعہ پیسے کمانے کے مختلف طریقے ایجاد ہوگئے ہیں، ای کامرس (یعنی آن لائن کاروبار) کا یہ ایک اہم موضوع سمجھا جاتا ہے، روز بروز اس کی نت نئی شکلیں سامنے آرہی ہیں، بنیادی طور پر پہلے انٹرنیٹ کی ایک اہم ملٹی نیشنل کمپنی ''گوگل''(Google) سے واقفیت ضروری ہے، اس لئے کہ آن لائن اشہارات کے زیادہ طریقے اسی سے وابستہ ہیں۔

''گوگل'' کا تعارف مختصر لفظوں میں ''تلاش انجن''(Enginesearch) سے کیا جاسکتا ہے، شروع شروع میں گوگل کا مقصد بالعموم عام صارفین کو انٹرنیٹ پر کسی بھی موضوع پر درکار مواد تلاش کرنے کی سہولت فراہم کرنا تھا، اسی وجہ سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی؛ لیکن اس وقت گوگل متعلقہ مواد کی تلاش (Search) کے ساتھ ساتھ بے شمار خدمات مہیا کررہا ہے، مثلاً: برقی پیغام رسانی(Google mail)، ویڈیو شیئرنگ(You Tube)، سوشل نیٹ ورک(Social Network)، نقشہ جات(Google Maps)، گوگل پے(Google Pay)، گوگل ایڈسینس(Google Adsense) وغیرہ۔

گوگل کی آمدنی کا بڑا انحصار انٹرنیٹ اشتہار کاری پر ہے، اشتہارات کی نوعیت اور لین دین کی شرائط وتفصیلات کے اعتبار سے اس کے بیسوں طریقے مروج ہیں، ذیل میں زیادہ رائج اور مشہور طریقے درج کئے جارہے ہیں :

(الف) گوگل ایڈسینس (Google Adsense) گوگل کمپنی کی ایک اہم سروس ہے، جس کے ذریعہ سب سے زیادہ آن لائن اشتہارات لئے جاتے ہیں، اور دیئے بھی جاتے ہیں، گوگل ایڈسینس پر آنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ بلاگر (Blogger) جو گوگل کا ایک پروگرام ہے کے ذریعہ پہلے ایک ویب سائٹ بنائی جاتی ہے، اس ویب سائٹ کے لئے مثلاً: پندرہ سے بیس مضامین لکھے جاتے ہیں (ویب سائٹ کی نوعیتیں مختلف ہوسکتی ہیں) ویب سائٹ کو اچھے سے اچھا بنایا جاتا ہے؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس کو دیکھیں اور گوگل ایڈسینس اُسے اشتہار کے

پروگرام کے لئے منظور کرلے ،منظوری کے بعد گوگل ایڈسینس ایسی ویب سائٹس پر مختلف کمپنیوں کے اشتہارات لگاتی ہے، گوگل ایڈسینس کا بنیادی کام مشتہر (Advitisers) اور طابع (Publishers) کے درمیان واسطہ بننا ہے، مشتہر سے مراد وہ ادارے یا کمپنیاں ہیں جو اپنے کاروبار کی تشہیر چاہتے ہیں، جب کہ طابع سے مراد وہ ویب سائٹ مالکان ہیں جو اپنی ویب سائٹس پر دیگر کمپنیوں کے اشتہارات لگانا چاہتے ہیں ، گوگل ایڈسینس اپنے مقررہ قواعد وضوابط کے مطابق مختلف کمپنیوں سے طے شدہ معاوضہ لے کر اشتہارات حاصل کرتی ہے اور اشتہارات کو مذکورہ بالا ویب سائٹس پر موجود آڈیوز ، ویڈیوز اور مختلف تحقیقی مضامین وغیرہ کے ساتھ لگاتی ہے ، جب کوئی شخص ایسی ویب سائٹس پر جا کر یہ اشتہارات دیکھتا یا اُن پر کلک کرتا ہے تو گوگل متعلقہ کمپنیوں کے اکاؤنٹس سے طے شدہ معاوضہ لے کر کچھ حصہ خود رکھ لیتی ہے اور کچھ ان ویب سائٹس مالکان کو دے دیتی ہے۔

چوں کہ حقیقی گاہکوں (Costumers) سے کلک (Click) یا تبصرے (Views) حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے؛ اس لئے بعض کمپنیاں خود یا اپنے جاننے والوں کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ اُن کی ویب سائٹس پر آ کر اشتہارات دیکھیں اور اُن کلک کریں ، آپس میں اس کام کا معاوضہ بھی طے ہوتا ہے، بعض ماہرین فن سے معلوم ہوا کہ گوگل ایڈسینس کی طرف سے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ؛ کیوں کہ یہ سراسر دھوکہ اور جعل سازی ہے ، اگر گوگل ایڈسینس کے علم میں یہ بات آئے کہ کسی نے مذکورہ بالا غلط طریقے سے اپنی ویڈیوز کے کلکس اور تبصرے بڑھائے ہیں، تو وہ کمائی گئی رقم روک لینے اور متعلقہ اکاؤنٹ بلاک کرنے کا قانونی اختیار رکھتی ہے۔

قابل تنقیح سوالات :

اب مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوال یہ ہے کہ :

(۱) یہاں سوال یہ ہے کہ کمپنیوں کا گوگل ایڈسینس سے رابطہ کر کے مختلف ذرائع سے اشتہارات کرانا کیسا ہے؟ جب کہ گوگل ایڈسینس جائز اُمور کے ساتھ ساتھ حرام پروجیکٹ یا ویڈیو یا نیم برہنہ تصاویر یا میوزک ، گانے اور فحش قسم کے مواد پر بھی اشتہارات دیتی ہے، تو کیا یہ عمل جائز ہوگا ؟ اور دونوں کے درمیان معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

(۲) اسی طرح گوگل ایڈسینس سے اپنی ویب سائٹ وغیرہ رجسٹرڈ کروا کر اشتہارات حاصل کرنا اور ویب سائٹ پر منسلک کئے جانے والے اشتہارات دیکھنے اور اُن پر کلک کرنے پر معاوضہ لینا شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم رکھتا ہے؟ اس کی فقہی تطبیق کیا ہوگی؟

نوٹ:- واضح رہے کہ معاوضہ طے کرنے کے مختلف طریقے مروج ہیں، مثلاً :

(الف) سائٹ پر جتنی بار اشتہار دکھائے جائیں گے، اُس کے حساب سے معاوضہ ملے گا، اس کو کاسٹ پرایمپریشن (Cost Perimpression) کہا جاتا ہے۔

(ب) سائٹ پر جتنی بار اشتہار پر کلک کیا جائے گا، اسی حساب سے معاوضہ ملے گا، اُس کو کاسٹ پر کلک (Cost Per Click) کہا جاتا ہے۔

(ج) جب اشتہار کے ذریعہ متعلقہ سامان خریدا جائے یا متعلقہ خدمت حاصل کی جائے تو معاوضہ ملے گا، اُس کو کاسٹ پرا یکویسیشن (Cost Per Acquisition) کہا جاتا ہے۔

(د) جن کمپنیوں کی فروحت کم ہوتی ہے، وہ اپنا اشتہار سائٹ کے مالکان کو مہینے کے حساب سے معاوضہ طے کرکے دے دیتی ہے، اس میں کوئی شرط نہیں ہوتی کہ اشتہار کتنی بار دِکھایا جائے یا کوئی کلک کرے یا نہ کرے، اس کو فلیٹ ریٹ (Flate Rate) کہا جاتا ہے۔

(۳) آن لائن اشتہارات کے لئے مشہور ویب سائٹس، جیسے: جی میل (Gmail) یوٹیوب (You Tube) وغیرہ کے مرکزی صفحہ پر باکس کی شکل میں چھوٹی بڑی جگہیں فروخت کی جاتی ہیں، جن کو متعلقہ کمپنیاں محدود مدت کے لئے خرید کر اپنی مصنوعات کا اشتہار لگاتی ہیں، اس کو اسپانسر ایڈس (Sponsor Ads) کہا جاتا ہے، اس معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ بسا اوقات بعض کمپنیاں ویب سائٹ کی مخصوص جگہیں خرید کر دوسری کمپنیوں کو زیادہ قیمت پر فروخت کردیتی ہیں اور اُس میں بولیاں بھی لگائی جاتی ہیں؟

(۴) گوگل ایڈسینس جن ویب سائٹس کے مالکان سے کمپنیوں کے اشتہارات لگانے کا معاملہ کرتی ہے، ایسی ویب سائٹس کے مالکان اپنی ویب سائٹ کا دائرہ وسیع کرنے اور اشتہارات کو دیکھنے اور اُن پر کلک کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے عام لوگوں کو یہ پیشکش کرتے ہیں کہ وہ اپنا رجسٹریشن کرا کر (کبھی فیس دے کر اور کبھی مفت) ویب سائٹ پر آکر اشتہارات پر کلک کریں، جس کے بدلے طے شدہ اُصول وضوابط کے مطابق انھیں معاوضہ دیا جائے، اس طرح ویب سائٹ پر چسپاں کئے گئے اشتہارات کو دیکھنے اور کلک کرنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے، جس کا معاوضہ ویب سائٹ مالکان گوگل ایڈسینس سے وصول کرتے ہیں اور گوگل ایڈسینس متعلقہ کمپنیوں سے معاوضہ لیتی ہے، اب اِس میں سوال یہ ہے کہ عام لوگوں کا ویب سائٹ پر جا کر اشتہار پر کلک کرنے کا معاوضہ لینا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اس میں ایک تنقیح تو اشتہارات کی نوعیت سے متعلق ہے، جب کہ دوسری تنقیح اس معاملہ کی فقہی حیثیت سے متعلق ہے، کیا اس کو اجارہ کا معاملہ قرار دیا جائے گا۔

واضح رہے کہ بعض ماہرین فن کی تحقیق کے مطابق گوگل ایڈسینس کی طرف سے قانوناً اس کی ممانعت ہوتی ہے کہ ویب سائٹ والے فرضی طور پر لوگوں کو معاوضہ دے کر اشتہارات پر کلک کروائیں، جیسا کہ اوپر گذرا۔

(۵) کمپنی کے اشتہارات کا اس وقت ایک طریقہ (جو اگر چہ انٹرنیٹ سے متعلق نہیں ہے؛ لیکن کثیر الوقوع ہے) یہ بھی ہے کہ فلم اور کھیل کود کے پروگرام میں مختلف طریقوں سے (مثلاً: کھلاڑی کے لباس، کھیل کود کے سامان اور میدان کی دیواروں پر، اسی طرح اداکاروں کے لباس وغیرہ پر اور پروگرام نشر ہونے کے درمیان) کمپنی کا نام یا لوگو (Logo) استعمال کرکے بھاری معاوضہ لے کر اشتہارات دیئے جاتے ہیں، اس طریقۂ کار کا کیا حکم ہے؟

مختلف موبائل اپیس کی سہولیات سے نفع اُٹھانا

(۶) اس کے ضمن میں یہ سوال ہے کہ آج کل پے ٹی ایم (Paytm) ایم پیسہ (M-Paisa) ایزی پیسہ (Easy Paisa) فری چارج (Free Charge) اور موبی وک (Mobi Kwik) گوگل پے (Google Pay) وغیرہ کے نام سے بہت سے پروگرام (Mobile App) انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں، جن کو ای والٹ (E-Wallet) یا ڈیجیٹل والٹ (Digital Wallet) کہا جاتا ہے، جنھیں ڈاؤن لوڈ کرنے اور اُن میں اپنا اکاؤنٹ کھولنے کے بعد یہ سہولیات حاصل ہوجاتی ہیں کہ اپنے اکاؤنٹ سے پیسے اس میں جمع رکھیں اور اُن کے ذریعہ پیسے دوسروں کو منتقل کریں، یا بجلی، گیس وغیرہ کا بل ادا کریں یا خریداری کریں، ان پروگرامس کے ذریعہ بل کی ادائیگی اور خریداری وغیرہ کرکے پیمنٹ کرنے پر چھوٹ (Discount) دی جاتی ہے، کبھی کیش بیک (Cash Back) کے نام سے کبھی پوائنٹ کے عنوان سے، کبھی کسی دوسرے عنوان سے، ان ڈسکاؤنٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ انعام، حط عن الثمن یا کچھ اور؟ اس طرح لین دین کرکے فائدہ اُٹھانا شرعی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟ اِن ڈیجیٹل والٹ سے صارفین کے معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

سوال نامہ (۳)

موبائل اپلی کیشن کے ذریعہ ٹیکسی وغیرہ کرایہ پر لینے کی ایک نئی شکل

کچھ کمپنیاں موبائل اپلی کیشن (Mobile Application) کے ذریعہ ٹیکسی کی سہولت عوام کو فراہم کرتی ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ کمپنی اپنی ذاتی گاڑی بطور ٹیکسی استعمال نہیں کرتی؛ بلکہ گاڑیاں عام لوگوں کی ہوتی ہیں، جو کمپنی سے رجسٹرڈ ہوکر پھر کمپنی کی اپلی کیشن کے توسط سے مسافروں کو آرام دہ اور کم خرچ سفر کی سہولت مہیا کرتی ہیں، اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کمپنی اور گاڑی مالکان کے درمیان ہونے والے عقد کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس عقد کی ضروری تفصیلات درج ذیل ہیں :

۱- کمپنی کی ذمہ داریاں

کمپنی کے ذمہ کئی اُمور ہوتے ہیں، مثلاً: بذریعہ ایپلی کیشن مسافروں کا رجسٹرڈ گاڑیوں سے رابطہ پیدا کرنا، گاڑیوں کی نگرانی کے ذریعہ سفر کو محفوظ بنانا، جی پی ایس سروس کی سہولت فراہم کرنا، گاڑی مالکان کو سہولت فراہم کرنا کہ وہ اپنے موبائل کے ذریعہ ڈرائیور گاڑی کی معلومات حاصل کرسکیں، وغیرہ وغیرہ۔

۲- گاڑی کے مالکان کی ذمہ داریاں

گاڑیوں کے مالکان کے ذمہ مسافروں کو آرام دہ سفر کی سہولت مہیا کرنا ہے اور یہ مالکان کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ گاڑی خود چلائیں یا ڈرائیور کے حوالے کریں، اور خود اُسے اُجرت دیں، کمپنی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ بھی مالکان کی ذاتی صواب دید پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ یومیہ کتنے گھنٹے کام کریں گے؛ البتہ جس قدر آمدنی انھیں حاصل ہوگی، اس میں سے کمپنی اپنا فیصد وصول کرکے باقی رقم مالکان کے حوالہ کردے گی، خواہ وہ تھوڑے وقت کی تھوڑی آمدنی ہو یا اس کے برعکس ہو؛ لیکن گارینٹیڈ پیمنٹ حاصل کرنے کے لئے کم از کم مدت متعین ہوتی ہے، جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

۳- سفر کے کرایہ سے متعلق تفصیلات

کرایہ کمپنی خود طے کرتی ہے، جس میں گاڑی مالکان کی رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا؛ البتہ کرایہ میں کسی قسم کے ردوبدل سے اُن کو باخبر رکھا جاتا ہے، کرایہ کے بنیادی طور پر تین حصے ہوتے ہیں:

(۱) بنیادی کرایہ مثلاً: ۱۰۰ روپے۔

(۲) فی کلومیٹر کرایہ مثلاً: ۱۰ روپے۔

(۳) فی منٹ کرایہ مثلاً: ۳ر روپے۔

بنیادی کرایہ کا مطلب یہ ہے کہ طے کردہ مسافت اور وقت کے کرایہ کو جمع کرکے ٹوٹل نکالا جاتا ہے اور فی منٹ کرایہ بعض کمپنیوں کے یہاں اُسی وقت چارج کیا جاتا ہے، جب کہ گاڑی کی رفتار مقررہ حد مثلاً: ۱۵ رکلومیٹر فی گھنٹہ سے کم ہوجائے، جب کہ بعض کمپنیاں رفتار کی کوئی تحدید نہیں کرتیں؛ بلکہ سفر میں کل صرف شدہ وقت پر فی منٹ چارج کرلیتی ہیں۔

بعض کمپنیاں نئے مسافروں کو پہلی رائڈ (بنیادی کرایہ پر بکنگ) مفت دیتی ہیں؛ لیکن گاڑی مالکان کو اس رائڈ کی ادائیگی کمپنی کی جانب سے اس کے حصہ کے مطابق کردی جاتی ہے۔

گاڑی طلب کرنے کے لئے ریکویسٹ (درخواست) بھیجنے کے بعد ابتدائی دو یا تین منٹ کے اندر مسافر رائڈ رد کرسکتا ہے، اس کے بعد منسوخی کی صورت میں کمپنی تقریباً پچاس روپئے یا کم وبیش جرمانہ وصول کرتی ہے، جس کی وصولی اس مسافر کی اگلی رائڈ کے کرایہ میں شامل کر کے کی جاتی ہے۔

۴- متعاقدین کے مابین آمدنی کی تقسیم

اس کی بیادی طور پر دو شقیں ہیں :

(الف) طے شدہ متعین رقم (Guaranteed Payments): اس میں کمپنی گاڑی کے مالک کو ایک طے شدہ رقم دینے کی پابند ہوتی ہے؛ لیکن چند شرائط کے ساتھ یعنی (۱) اگر گاڑی کے ڈرائیور کی کمپنی کے توسط سے مسافروں کی وصول ہونے والی درخواست (Request) کو قبول کرنے کی شرح ۹۰ فیصد ہوجائے، (۲) وہ یومیہ کم ازکم گیارہ گھنٹے ڈیوٹی پر موجود رہے، (۳) یومیہ کم ازکم دس مسافروں کو سفر کی سہولت بہم پہنچائے تو کمپنی اُسے طے شدہ رقم، مثلاً: ۵۳۰۰/روپئے دینے کی پابند ہوگی، اگر ڈرائیور کی اُس روز کی کمائی ۵۳۰۰/روپئے سے کم ہو تو کمپنی اپنے پاس سے رقم پوری کر کے ادا کرے گی اور اگر ڈرائیور کی کمائی طے شدہ رقم مثلاً: ۵۳۰۰/ر سے زیادہ ہو تو زائد رقم کمپنی کی ہوگی خواہ وہ کتنی ہی ہو، بعض کمپنیوں کا ضابطہ اس سے قدرے مختلف بھی ہوتا ہے، مثلا: بعض کمپنیاں ہفتہ وار نفع کی تقسیم کرتی ہیں، اس طرح کہ گاڑی مالکان کو ہفتہ بھر میں جو آمدنی ہوئی ہے خواہ وہ مقررہ رقم کی شرائط پوری کرتے ہوئے حاصل ہوئی ہو یا اس کے بغیر، کمپنی اس کی آمدنی کا پچیس فیصد خود رکھ لیتی ہے اور باقی گاڑی کے مالک کے حوالہ کر دیتی ہے؛ البتہ طے شدہ رقم کی شرائط پوری کر دینے کے باوجود اگر آمدنی طے شدہ سے کم ہو تو کمپنی پھر بھی طے شدہ رقم دینے کی پابند ہوگی؛ لیکن ہفتہ بھر کے حساب میں کمپنی اپنے پچیس فیصد اس میں سے بھی وصول کرے گی۔

(ب) فیصدی تقسیم: اگر گارینٹیڈ پے منٹ کی شرائط پوری نہ ہوں تو کمپنی حاصل شدہ آمدنی میں سے اپنا فیصدی حصہ وصول کر کے بقیہ رقم گاڑی کے مالک کو دے دیتی ہے۔

(ج) بونس: کمپنیوں کی طرف سے گاڑی مالکان کو بونس بھی دیا جاتا ہے، جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، مثلاً: ہفتہ وار بونس، جمعہ اور ہفتہ کو دس رائیڈز پر ایک ہزار روپئے یومیہ بونس دیا جاتا ہے، کبھی چودہ روزہ بونس دیا جاتا ہے، یعنی: اگر دو ہفتہ میں مثلاً: ایک سو پچھتر رائیڈز (Ride) کرلیں، تو دس ہزار بونس ملے گا، وغیرہ وغیرہ، اسی طرح بعض کمپنیاں ڈرائیور کو علاحدہ سے بونس دیتی ہیں، جس کے لین دین سے گاڑی کے مالک کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، گویا کمپنی ڈرائیور کی کارکردگی پر اسے انعام دیتی ہے، یہ بونس بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔

سوالات

(۱) مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک معاملہ تو کمپنی اور گاڑی کے مالکان کے درمیان ہوتا ہے کہ جب کمپنی سے سواری کی خدمت طلب کی جائے گی، تو کمپنی اُس کے لئے گاڑی کے مالک کی خدمت حاصل کرے گی، جب کہ ایک معاملہ گاہک اور کمپنی کے درمیان ہوتا ہے، دونوں معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

(۲) کمپنی اور گاڑی کے مالکان، اسی طرح کمپنی اور گاہک کے درمیان قیمت کے تعیین کا جو طریقہ ذکر کیا گیا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے کیا حکم رکھتا ہے؟

(۳) کیا اجارہ میں اُجرت کی جہالت علی الاطلاق ممنوع ہے؟

(۴) گاڑی مالکان اور ڈرائیور کو ملنے والے بونس کا کیا حکم ہے؟

(۵) سواری طلب کرنے کے بعد منسوخ کرنے کی صورت میں کمپنی کا جرمانہ وصول کرنا، نیز مذکورہ بالا طریقہ پر کمپنی اور مالک کے درمیان تقسیم کرنا کیسا ہے؟ کیا اس جرمانے کو کمپنی کی اپلی کیشن فیس قرار دیا جاسکتا ہے؟

(و) لوگوں کے لئے اس طرح کے معاہدے پر چلنے والی گاڑیوں سے سواری کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال نامہ (۴)

فرنچائز کا شرعی حکم

اس وقت کاروبار کا ایک نیا طریقہ فرنچائز (Frenchise) کے نام سے چل رہا ہے، یعنی کسی مخصوص علاقے میں کسی کمپنی کی مصنوعات (Product) اُس کے نام سے فروخت کرنے کے حق اور اجازت نامہ کو فرنچائز سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی تجارت وخدمات میں فرنچائز ایک قسم کے معاہدے کا نام ہے، جس کی رو سے کوئی کمپنی، شخص یا سرکاری ادارہ دوسری کمپنی یا شخص یا سرکاری ادارے کو متعین علاقہ میں طے شدہ مدت تک کے لئے مصنوعات اور خدمات فروخت کرنے کا حق دیتا ہے، اِس کو خریدنے والا (فرنچائز) فروخت کرنے والے (فرنچائزر) کو فیس ادا کرتا ہے، بعض مرتبہ وہ کمپنی کی مصنوعات کے فروخت کے تناسب سے کمپنی کو مخصوص فیصدی حصہ ادا کرتا ہے، جب کہ اس کے بدلے کمپنی یا متعلقہ ادارہ (فرنچائزر) اُسے مختلف سروس (Services) مہیا کرتا ہے، مثلاً ملازمین کی تربیت، تشہیر اور مالی تعاون وغیرہ، مزید برآں متعلقہ ادارہ اپنا تجارتی مارکہ (Goodwill) استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے، جس کی عام طور پر مارکیٹ میں بہت زیادہ قیمت اور اہمیت ہوتی ہے۔

صنعتی ادارے کا فرنچائز لینے والے سے معاہدہ کئی شرائط پر مشتمل ہوتا ہے، جو مندرجہ ذیل ہے :

(۱) فرنچائز لینے والا صنعتی ادارہ کا نام، تجارتی علامت (Monogram) وغیرہ استعمال کرے گا اور اس کے عوض باہم طے شدہ رقم صنعتی ادارہ کو دے گا۔

(۲) صنعتی ادارہ فرنچائز لینے والے کے علاوہ کسی اور کو مخصوص علاقہ میں اپنی مصنوعات فراہم نہیں کرے گا۔

(۳) فرنچائز لینے والا صنعتی ادارہ کے علاوہ کسی اور کی مصنوعات کی نہ ترویج (مارکیٹنگ) کرے گا، نہ فروخت کرے گا۔

(۴) فرنچائز لینے والے صنعتی ادارے کے مقرر کردہ قیمت سے کم وبیش پر مصنوعات نہ بیچے گا، نیز بیچنے کا طریقۂ کار، فرنچائز کی جگہ کی کمیت و کیفیت، بیچنے کے لئے ملازمین اور اُن کا لباس وغیرہ، یہ سب چیزیں صنعتی ادارے کی طے کردہ شرائط کے مطابق ہوں گی۔

(ب) کسی ادارے اور فرنچائز کے درمیان معاہدہ کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ فرنچائز لینے والا اشیاء خود تیار کر کے فروخت کرے گا؛ البتہ نام، تجارتی علامت، معروف فرنچائز دینے والے ادارے کی ہی استعمال ہوگی، اشیاء کو تیار کرنے کے لئے خام مال تیار کرنے کا طریقہ، بیچنے کی جگہ کی نوعیت، بیچنے کا طریقہ وغیرہ فرنچائز دینے والے ادارہ کی لگائی ہوئی شرائط کے مطابق ہوگا۔

(ج) بعض اسکول، کالج، ہسپتال یا دیگر خدماتی ادارے بھی اپنی فرنچائز دیتے ہیں، جس میں خدمات تو فرنچائز لینے والا ہی لوگوں کو مہیا کرے گا؛ البتہ معیار، طریقۂ کار، اُجرت وغیرہ فرنچائز دینے والا ادارہ طے کرتا ہے اور فرنچائز لینے والا اس معروف ادارہ کا استعمال کرنے کے عوض مخصوص رقم ادا کرتا ہے، مذکورہ تین صورتوں میں بعض فرنچائز لینے والے متعلقہ ادارے کو ایک مشت ادائیگی کے علاوہ ماہانہ یا سالانہ کچھ ادائیگی بھی کرتے ہیں، جس کی عموماً درج ذیل صورتیں ہوتی ہیں :

(۱) بعض اوقات یہ رقم لگی بندھی ہوتی ہے۔

(۲) بعض اوقات حاصل ہونے والے نفع میں سے کچھ فیصد طے ہوتا ہے۔

(۳) بعض اوقات کل آمدنی پر کچھ رقم متعین ہوتی ہے۔

نیز یہ مذکورہ تین قسم کی ادائیگی کبھی فقط متعلقہ ادارے کا نام، تجارتی علامت وغیرہ استعمال کرنے کے عوض ہوتی ہیں اور کبھی متعلقہ ادارے کے فرنچائز لینے والے کے کام کی وقتاً فوقتاً نگرانی کے بدلے، یا اس طرح کی کچھ دیگر خدمات مہیا کرنے کے عوض ہوتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ :

(۱) مذکورہ بالا تمام اقسام کی فرنچائز لینے اور دینے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲) جو شرائط طے کی جاتی ہیں، کیا معروف ہونے کی بناء پر اُن کی گنجائش دی جاسکتی ہے؟

(۳) صنعتی ادارے کا نام استعمال کرنے کے عوض ادارے کو مخصوص رقم بطور اُجرت دینا بظاہر اُس کی حیثیت اجارہ کی ہوتی ہے؛ لیکن اجارہ اعیان حسیہ اور مادی اشیاء کا ہوتا ہے، تو کیا غیر مادی اشیاء کے اجارہ کی گنجائش دی جاسکتی ہے؟

(۴) متعلقہ ادارے اور فرنچائز لینے والے کے درمیان اُجرت کا تعین کیا منافع کے فیصد کے تناسب سے طے کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس معاملہ کو شرکت یا مضاربت قرار دیا جاسکتا ہے؟

(من جانب : ادارۃ المباحث الفقہیہ ، جمعیۃ علماء ہند)

● ● ●

جوابات :

سرکاری وغیر سرکاری منفعت بخش اسکیموں کے سلسلہ میں غور کرتے ہوئے اس کے پس منظر کو ذہن میں رکھنا چاہئے ، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر حکومت ٹیکس نہ لیتی ہو، سڑک پر چلنے اور ڈرینج کے استعمال کا بھی ٹیکس عوام پر عائد ہوتا ہے، اور اگر ہم ایک بوتل پانی یا قلم خریدیں، یا ایک کپ چائے پئیں تو اس میں بھی ایک حصہ ٹیکس کا ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں تو ٹیکس کی شرح ساٹھ فیصد اور کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، حکومت ٹیکس کی یہ رقم عوامی فلاح و بہبود کے عنوان سے حاصل کرتی ہے؛ لیکن ٹیکس کی مقدار کے اعتبار سے عوام کو جو سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں، ترقی پذیر ممالک میں اس کا بہت کم حصہ عوام کو حاصل ہوتا ہے، مثلاً تعلیم، صحت اور انصاف بنیادی ضرورتیں ہیں؛ لیکن حکومت ان شعبوں پر بہت کم خرچ کرتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ عوام سرکاری اسکولوں کے بجائے پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری ہاسپیٹلوں کے بجائے پرائیویٹ ہاسپیٹلوں میں علاج کرانے پر مجبور ہیں، جو کم آمدنی والوں کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے؛ اسی لئے حکومت کی مضبوط تشہیری کوششوں کے باوجود شرح تعلیم میں زیادہ اضافہ نہیں ہو پا رہا ہے، بین الاقوامی جائزہ کے مطابق صحت کے اعتبار سے ہندوستان افریقی ملکوں کی طرح نچلی سطح پر ہے، اور انصاف کا حال یہ ہے کہ چند سال پہلے چیف جسٹس آف انڈیا نے کہا تھا کہ ہندوستان کے ہائی کورٹوں پر مقدمات کا اتنا بوجھ ہے کہ اگر موجودہ رفتار کے مطابق کارروائی جاری رہے تو موجودہ مقدمات کو نپٹانے میں ۱۶۱ر سال لگ جائیں گے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت مطلوبہ تعداد میں ججس بحال نہیں کرتی۔

ٹیکس کی جو شرح ہمارے ملک میں ہے، کم وبیش وہی شرح مغربی ممالک جیسے برطانیہ میں بھی ہے؛ لیکن برطانیہ میں ہر لڑکے اور لڑکی کی بارہویں کلاس تک معیاری تعلیم کی ذمہ داری حکومت قبول کرتی ہے، ہر شہری کے لئے علاج کی سہولت فراہم کرتی ہے، یہاں تک کہ رہائش کی سہولت بھی مہیا کرتی ہے، اور اگر کوئی لڑکا یا لڑکی ۱۶ر سال کا ہو گیا اور حکومت مکان فراہم نہیں کر سکی تو اس کو کرایہ ادا کرتی ہے؛ لیکن ہمارے ملک میں حکومت نے ان ذمہ داریوں سے اپنا ہاتھ اُٹھا رکھا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے حکومت مختلف طبقات کے لئے اس لئے ایسی اسکیمیں لاتی ہے؛ عوام

کی ان ضرورتوں کو پورا کرنا حکومت کا فریضہ ہے؛ لہٰذا ایسی اسکیموں پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ اپنی روح کے اعتبار سے حکومت کی طرف سے عوام کا تعاون ہے، اور اَز قبیل تبرعات ہے نہ کہ از قبیل معاوضات؛ البتہ حکومت اس کو بعض شرائط کے ساتھ مشروط کر دیتی ہے؛ تاکہ مستحق حضرات ہی اس سے استفادہ کر سکیں، ہر آدمی اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرے، میرے علم کے مطابق ان اسکیموں سے فائدہ اُٹھانے میں ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی سالانہ انکم اتنی مقدار سے زیادہ نہ ہو؛ تاکہ غریبوں کو اس کا فائدہ پہنچے۔

ان اسکیموں پر غور کرتے ہوئے اس پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے؛ کیوں کہ شریعت میں اہمیت تو مقصد کی بھی ہے اور شکل کی بھی؛ لیکن معاملات میں مقاصد کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے؛ چنانچہ فقہ کا مشہور اور متفق علیہ قاعدہ ہے: ''الأمور بمقاصدها'' معاملات میں اس کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں ان سوالات کے حسب ذیل جوابات سمجھ میں آتے ہیں :

۱- بچیوں کی پیدائش پر تعاون کی اسکیم

(الف) اس صورت میں حکومت ہی ابتداءً دس ہزار روپئے لڑکی کے نام پر جمع کرتی ہے اور پندرہ سال پورے ہونے پر حکومت ہی مزید ایک لاکھ روپیہ جمع کرتی ہے، لڑکی کی طرف سے کوئی رقم جمع نہیں کی جاتی، تو اس میں سود کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا؛ کیوں کہ ربا تو عقد معاوضہ میں پیدا ہوتا ہے، جب کہ عوضین ایک ہی جنس کے ہوں، اور ایک طرف سے ایسا اضافہ پایا جائے، جس کے مقابلہ میں دوسرے کی طرف سے کچھ نہ ہو، علامہ موصلیؒ کے الفاظ ہیں :

> وفي الشرع : الزيادة المشروطة في العقد وهذا إنما يكون عند المقابلة بالجنس ۔ (۱)

نیز علامہ نسفیؒ کا بیان ہے :

> هو فضل مال بلا عوض في معاوضة مال بمال ۔ (۲)

اس لئے یہ پوری کی پوری رقم حکومت کی طرف سے تبرع سمجھی جائے گی اور اس سے نفع اُٹھانا حلال ہوگا۔

(ب) اس صورت میں حکومت ۱۸؍سال کے بعد تین گنا رقم دینے کا وعدہ کرتی ہے اور حسب وعدہ اسے

---

(۱) الاختیار شرح المختار: ۲؍۳۰، کتاب البیوع، باب الربا۔

(۲) کنز الدقائق مع التبیین: ۴؍۸۵، کتاب البیوع، باب الربا۔

پورا کرتی ہے، یہ حکومت کی طرف سے تبرع ہے، بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں شادی کے اخراجات کے خوف سے لڑکیوں کے اسقاط کا تناسب بہت بڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ ہندوستان میں ایک ہزار لڑکی کے مقابلہ نوسو یا اس سے کچھ ہی زیادہ لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں، اور پنجاب و ہریانہ کی ریاستوں میں تو ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ آٹھ سو سے بھی کم لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس طرح کی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت نے ''بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ'' کی ایک تحریک شروع کی ہے؛ اس لئے یہ ایک امدادی اسکیم ہے؛ تاکہ لڑکیوں کی تعلیم اور شادی میں سہولت ہو، یہ لڑکی کے نام پر جمع کی جانے والی رقم کا عوض نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو ''تبرع مشروط'' کہا جاسکتا ہے کہ گارجین سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ جتنی بچت کریں گے، اس کا تین گنا اس لڑکی کے لئے حکومت ادا کرے گی، اور تبرع چوں کہ عقد معاوضہ نہیں ہوتا؛ اس لئے اس میں شرط لگانا باعث فساد نہیں، یہ اور بات ہے کہ بعض صورتوں میں ہبہ بھی درست ہوتا ہے اور شرط بھی معتبر ہوتی ہے، اور بعض صورتوں میں ہبہ درست ہوتا ہے اور شرط باطل ہوجاتی ہے :

وهب أمة إلا حملها ، وعلى أن يردها عليه أو يعتقها أو يستولدها أو وهب دارا على أن يرد عليه شيئاً منها ولو معيناً كثلث الدار أو ربعها أو على أن يعوض في الهبة والصدقة شيئاً عنها صحت الهبة وبطل الاستثناء في الصورة الاولیٰ وبطل الشرط في الصورة الباقية ؛ لأنه بعض أو مجهول والهبة لا تبطل بالشروط ۔ (۱)

بظاہر یہ صورت پرائیوڈنڈ فنڈ کی طرح ہے، جس میں ملازم ہر ماہ ایک رقم جمع کراتا ہے اور اخیر میں حکومت اس کو بڑھا کر واپس کرتی ہے؛ اس لئے اس کو جائز ہونا چاہئے، واللہ اعلم ۔

۲- بے روزگار نوجوانوں کے لئے تعاون کی اسکیم

جمہوری نظام میں روزگار کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے؛ اسی لئے بہت سے ملکوں میں بے روزگار نوجوانوں کو حکومت اتنی مقدار میں وظیفہ دیتی ہے، جس سے اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوجائیں، جس کو بے روزگاری الاؤنس کہا جاتا ہے، اور اگر کوئی پرائیویٹ ملازمت کرتا ہو اور لیبر لاء کے تحت اجرت کی جو کم سے کم مقدار متعین ہو، اس سے کم تنخواہ پاتا ہو تو حکومت اپنی طرف سے اس کمی کو پورا کرتی ہے؛ لیکن ہمارے ملک میں حکومت نہ روزگار کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور نہ بے روزگاروں کو ایسا الاؤنس دیتی ہے، جس سے وہ دو وقت کا کھانا بھی کھاسکیں، یہ اسکیم اسی کے متبادل کے طور پر ہے؛ تاکہ بے روزگار نوجوان کسی ہنر کے ذریعہ تھوڑے پیسوں میں ضروری حد تک روزگار حاصل کرسکیں، اسی پس منظر میں اس صورت کو دیکھنا چاہئے ۔

(۱) ردالمحتار علی الدر کتاب الہبۃ، فصل فی المسائل المتفرقۃ: ۵/۷۰۶ ۔

حکومت جو ۸ ر ہزار روپے دیتی ہے اس کا تعاون ہونا تو ظاہر ہے؛ کیوں کہ حکومت کی طرف سے اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں ہے، اب جو ۲ ر ہزار روپیہ بطور قرض کے ہے، اس پر عائد کیا جانے والا سود ۸ ر ہزار روپیہ سے کم ہوتا ہو تو یہ شکل سود میں شامل نہیں، حکومت چاہے اپنی اصطلاح کے مطابق ایک رقم کو سبسڈی اور ایک رقم کو انٹرسٹ کا نام دے؛ لیکن جب بحیثیت مجموعی حکومت نے زائد رقم دی، اور لینے والے سے کم رقم وصول کی تو یہ سود کے دائرہ میں نہیں آئے گا؛ البتہ مسلمانوں کو مشورہ دینا چاہئے کہ جب وہ اس طرح کی رعایتی رقم حاصل کریں تو ۸ ر ہزار میں سے ۲ ر ہزار روپیہ پہلے ادا کردیں؛ تاکہ وہ امکانی طور پر سود دینے سے بچ جائیں۔

عام طور پر ہندوستان کے اکابر علماء نے بھی سبسڈی اور قرض کی مربوط اسکیم کے بارے میں یہی فتویٰ دیا ہے۔

۳- اعلیٰ تعلیم کے لئے آسان شرطوں پر قرض کی اسکیم

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو منظم طور پر تعلیمی اعتبار سے پسماندہ بنانے کی سازشیں کی جارہی ہیں، اور اعلیٰ تعلیم پر مبنی ملازمتوں میں ان کا تناسب کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، مسلمانوں کے لئے اعلیٰ عصری تعلیم کا حصول حاجت کے درجہ میں ہے، اور اس سے محرومی کی وجہ سے قومی اور اجتماعی سطح پر غیر معمولی نقصان پہنچ رہا ہے، جس کا اصحاب دانش کو خوب اندازہ ہے؛ اس لئے اس وقت اعلیٰ تعلیم کا حصول اور اس کے ذریعہ ان سرکاری ملازمتوں تک پہنچنا — جو قومی پالیسیاں طے کرتے ہیں — ایک اجتماعی حاجت کے درجہ میں ہے؛ اس لئے تین شرطوں اور ایک تنبیہ کے ساتھ اس کی گنجائش ہونی چاہئے، پہلی شرط یہ ہے کہ طالب علم نے اُس اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی لیاقت ثابت کردی ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اموال منقولہ یا غیر منقولہ کی شکل میں اتنا مال موجود نہیں ہو کہ وہ خود اس تعلیم کا خرچ پورا کر سکے، تیسری شرط یہ ہے کہ اس کو کسی ادارہ یا فرد سے غیر سودی قرض فراہم نہیں ہو پائے، تو اس صورت میں اس کے لئے اس طرح کا قرض لینے کی گنجائش ہوگی، دوران تعلیم حکومت نے بینک کو جو سود ادا کیا؛ چوں کہ اس کی ذمہ داری طالب علم پر نہیں ہوگی؛ اس لئے یہ حکومت کا عمل ہے، اور ویسے بینک بھی حکومت ہی کا ادارہ ہے؛ اس لئے حکومت ایک ہاتھ سے پیسے دے رہی ہے اور دوسرے ہاتھ سے لے رہی ہے۔

رہ گیا اس مدت کے بعد تاخیر پر انٹرسٹ ادا کرنا تو اس سلسلہ میں قرض حاصل کرنے والوں کو متنبہ کیا جانا چاہئے کہ وہ جلد سے جلد قرض ادا کردیں؛ تاکہ انٹرسٹ سے بچ سکیں، اور باوجود کوشش کے اگر وہ بروقت پیسے ادا نہیں کر سکا تو اُمید ہے کہ یہ ''یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' کے دائرہ میں آجائے گا اور انشاء اللہ وہ گنہگار نہیں ہوگا۔

۴- تعلیم کے فروغ کے لئے بینک کی طرف سے جاری کردہ ایک اور اسکیم

یہ صورت جائز نہیں ہے، اس سلسلے میں چند نکات قابل توجہ ہیں :

(۱) سرکاری بینک اور پرائیویٹ بینک کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے، سرکار پر عوام کا حق ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو پوری کرے، اور اگر ضرورت پوری کرنے کے لئے وہ قرض دے اور اس پر زائد رقم کا مطالبہ کرے تو یہ اس کی طرف سے ظلم ہے، بخلاف ایکسس بینک یا کسی بھی پرائیویٹ بینک کے؛ اس لئے حاجت شدیدہ کے بغیر ان بینکوں سے قرض حاصل کرنا درست نہیں ہوگا۔

(۲) متعینہ رقم لینے کے بعد جب دیا جانے والا نفع زیادہ بھی ہوسکتا ہے تو یہ سیدھے طریقہ پر سود میں شامل ہے؛ بلکہ اس میں تفاضل بھی ہے اور نسا بھی۔

(۳) اگر اس کو مضاربت کے دائرے میں لایا جائے تو ایک تو مضاربت میں نقصان کی ذمہ داری رب المال پر ہوتی ہے اور اس میں رب المال پر نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی گئی، دوسرے ہندوستان میں برٹش دور کا بینکنگ قانون چل رہا ہے، جس میں بینک کو کسی بھی قسم کی تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، اس کا کام ہے اپنے مقروضوں سے سود وصول کرنا اور اپنے کھاتہ داروں کو سود ادا کرنا، تو بینک جو نفع دے گا، وہ بالیقین مال حرام ہی ہوگا، اور بینک کا یہ فعل اس شخص کی طرف بھی منسوب ہوگا؛ کیوں کہ مضارب رب المال کی طرف سے وکیل کے درجہ میں ہوتا ہے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

۵- مویشی پالن اسکیم

اس اسکیم کا مقصد مویشیوں کی افزائش نسل کی ترغیب دینا ہے؛ کیوں کہ مویشی کا گوشت، اس کا چمڑا، اس کا دُودھ اور دُودھ سے بنائی جانے والی مصنوعات کی بین الاقوامی مارکیٹ میں اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، بعض ملکوں کی معیشت میں اس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، حکومت چاہتی ہے کہ عوام اس شعبہ کی طرف توجہ کریں؛ تاکہ نہ صرف یہ کہ ملک کو باہر سے ان چیزوں کو امپورٹ نہ کرنا پڑے؛ بلکہ ہمارا ملک ان اشیاء کو ایکسپورٹ کر سکے اور اس کی وجہ سے ملک کے زرمبادلہ میں اضافہ ہو، اس پس منظر میں یہ حکومت کی طرف سے مویشی پالنے والوں کی مدد ہے کہ پانچ لاکھ روپئے ان کو بطور قرض بلا سود کے دیتی ہے، اور پانچ لاکھ روپئے اپنی طرف سے دیتی ہے، نیز جانور کے مرجانے پر حکومت کی طرف سے اس کی قیمت ادا کرنا بھی تعاون میں شامل ہے؛ لہٰذا شرعاً یہ تبرع کے حکم میں ہے۔

٦- ایکسپورٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے ڈرابیک پالیسی

ڈرابیک پالیسی بھی حکومت کی طرف سے ایک انعام ہے؛ کیوں کہ اندرون ملک جو تجارت ہوتی ہے، اس سے افراد کی دولت میں تو اضافہ ہوتا ہے؛ لیکن ملک کی دولت میں اضافہ نہیں ہوتا؛ مگر جب کوئی چیز ایکسپورٹ کی جاتی ہے اور بیرون ملک کی کمپنی یا فرد اس کی قیمت ادا کرتا ہے اور وہ رقم ہمارے ملک میں پہنچتی ہے تو اس سے زر

مبادلہ میں اضافہ ہوتا ہے اور ملک کی دولت بڑھتی ہے؛ اس لئے اس کے لینے میں حرج نہیں، حکومت کی جانب سے ملنے والے انعام کے سلسلہ میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ حکومت نے مال حرام میں سے یہ انعام دیا ہے تو اس انعام کو قبول کرنا جائز ہے :

قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالىٰ : اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان ، قال بعضهم : يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام ، قال محمد : وبه نأخذ مالم نعرف شيئاً حراما بعينه ، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ وأصحابه كذا في الظهيرية ۔ (۱)

اگر ہماری حکومت کے بجٹ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں آمد کے زیادہ تر ذرائع حلال ہوتے ہیں، جیسے : قدرتی وسائل، ریلوے، ٹیکس وغیرہ؛ اس لئے حکومت جو رقم دیتی ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مال حرام سے دی جانے والی رقم ہے۔

۷- ڈیبٹ کارڈ استعمال کرنے پر منافع کی اسکیم

ایس بی آئی (SBI) جو اپنے صارفین کو اسکیم دیتی ہے کہ وہ اس کے ڈیبٹ کارڈ سے جو کچھ خرید کرے گا، اس کا پانچ فیصد بینک اس کو واپس کرے گا، تو بظاہر اس کو جائز ہونا چاہئے ؛ کیوں کہ بینک از خود اپنا ڈیبٹ کارڈ استعمال کرنے والے کو یہ رقم دیتی ہے، یہ اس کی طرف سے عطیہ یا انعام ہے، دوسرے فریق کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے کہ بینک اسے رقم ادا کرے، ربا تو اس وقت ہوتا جب دونوں کے درمیان عقد ہو، اور اس میں ایک فریق ایسے اضافہ کا مطالبہ کرے جو خالی عن العوض ہو، اگر ایک فریق اپنے طور پر دوسرے فریق کے مطالبہ کے بغیر کوئی رقم بڑھ کر دے، تو یہ ربا میں شامل نہیں ہے، اور اس کی تاویل یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ چوں کہ ڈیبٹ کارڈ بینک کا ہے تو گویا بینک نے مال خریدا اور کم قیمت میں کارڈ ہولڈر سے فروخت کیا، جس کو فقہ کی اصطلاح میں بیع وضیعہ کہتے ہیں، اور یہ شکل جائز ہے :

وجائز لمن أتى السوق من أهله ، أو من غير أهله أن يبيع سلعته بأقل من سعرها في السوق وبأ كثر ولا اعتراض لأهل السوق عليه في ذالک ولا السلطان ۔ (۲)

انٹرنیٹ کے ذریعہ لین دین کی چند شکلیں

یوں تو سترہویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد ہی سے ایجادات واختراعات کی رفتار تیز ہوگئی ؛ لیکن

(۱) ہندیہ، کتاب الکراهیۃ، الباب الثانی عشر فی الهدایا: ۵/ ۲۴۳۔ (۲) المحلی بالآثار، کتاب البیوع: ۷/ ۳۵۷۔

بالخصوص گزشتہ ۵۲ رسالوں میں یہ رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی ہے، اور جس شعبہ میں سائنس نے سب سے زیادہ پیش قدمی کی ہے، وہ ہے: انفارمیشن ٹکنالوجی، دوسری ایجادات کے مقابلہ مغربی طاقتوں نے (جن کے ہاتھوں میں اس وقت سائنس کی لگام ہے) اس میدان کی ایجادات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی اور اس کو ارزاں اور سہل الحصول بنانے کی سرتوڑ کوشش کی ہے؛ کیوں کہ اس سے مغرب کے معاشی مفادات متعلق ہیں، اس کی وجہ سے امریکہ میں کام کرنے والی ایک کمپنی کو ہندوستان جیسے دور دراز ملک میں سستے مزدور مل جاتے ہیں، جو اپنے ملک میں رہتے ہوئے ان کی خدمت کرتے ہیں، نیز اس آلہ کے ذریعہ امریکہ کا نظام تجسس رائی سے لے کر پہاڑ تک پوری دنیا کو اپنے کنٹرول میں لئے ہوئے ہے، جب بھی ہم کسی موبائل کا استعمال کرتے ہیں تو ہمارے مخاطب سے پہلے ہماری بات ان لوگوں کے یہاں رکارڈ ہوجاتی ہے، جو اس کو وجود میں لائے ہیں۔

اچھی چیز بھی جب غلط ہاتھوں میں پروان چڑھتی ہے اور ان لوگوں کی آغوش میں تربیت پاتی ہے، جن کے یہاں حلال وحرام کا کوئی تصور نہیں ہے تو اس میں بہت سے مفاسد شامل ہوجاتے ہیں، اب ہم اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان ہی ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو مفاسد سے بچانے کی کوشش کریں؛ اس لئے جس چیز کا جائز وناجائز دونوں طرح پر استعمال ہوتا ہے، اس میں ہمارے لئے یہی راستہ ہے کہ ہم جائز مقصد کے لئے اس کا استعمال کریں۔

اس پس منظر میں سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں :

(۱) گوگل ایڈسینس گویا تشہیر کا ایک ذریعہ ہے، یہ جائز اشتہارات کو بھی نشر کرتا ہے اور ناجائز اشتہارات کو بھی، یہ اخبارات کی طرح ہے کہ ایک ہی اخبار میں بعض اوقات خلاف شرع چیزوں بالخصوص فلموں کا اشتہار بھی چھپتا ہے، اور اسی اخبار سے دینی جلسوں کی تشہیر بھی کی جاتی ہے، غرض کہ اس کی حیثیت ایک ذریعۂ محض کی ہے، جس کا جائز وناجائز دونوں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے؛ اس لئے جائز اُمور کی تشہیر کے لئے اس سے استفادہ کرنا جائز ہوگا، اور ناجائز کی تشہیر کے لئے ناجائز ہوگا، اور چوں کہ اُجرت لے کر یہ تشہیر کی جاتی ہے؛ اس لئے اس کی حیثیت اجارہ کی ہوگی؛ کیوں کہ اجارہ نام ہے: ''**تملیک نفع مقصود من العین بعوض**'' (۱) کا، اور اس معاملہ پر یہ تعریف صادق آتی ہے، اس ایڈ کا مقصد تشہیر ہے، یہی اس کا نفع ہے، اور اُجرت ادا کرنے والا اُجرت دے کر اس سے استفادہ کا حق حاصل کرتا ہے۔

یہ سوال چار جزء پر مشتمل ہے :

---

(۱) ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الاجارۃ: ۶/ ۳۔

(الف) ویب سائٹ رجسٹر کرانا، تو یہ جائز ہوگا؛ کیوں کہ اس ویب سائٹ کا استعمال مباح اور بہتر چیزوں کے لئے ہوسکتا ہے۔

(ب) فقہی اعتبار سے یہ بیع ہے کہ گوگل سے اپنی ویب سایٹ کے بقدر جگہ خرید کی گئی ہے، گوگل ایڈسینس بائع ہے اور رجسٹر کرانے والا مشتری، اسی طرح اشتہارات حاصل کرنا بھی جائز ہے؛ بشرطیکہ وہ حرام اور گناہ پر مشتمل نہ ہو، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ جو چیز ذریعہ کے درجہ میں ہو، اس کا حکم وہی ہوگا جس کے لئے اس کو ذریعہ بنایا گیا ہو:

لما كانت المقاصد لا يتوصل إليها إلا بأسباب وطرق تفضي إليها كانت طرقها وأسبابها تابعة لها معتبرة بها ۔ (۱)

نیز علامہ ابو اسحاق شاطبیؒ فرماتے ہیں:

إنا إذا نظرنا إلى كونه وسيلة فليس تركه أفضل بإطلاق ؛ بل هو ثلاثة أقسام : قسم يكون ذريعة إلى منهي عنه فيكون من تلك الجهة مطلوب الترک ، وقسم يكون ذريعة إلى مأمور به ، وقسم لا يكون ذريعة إلى شئي ؛ فهو المباح المطلق ، وعلى الجملة ، فإذا فرض ذريعة الیٰ غيره فحكمه حكم ذلک الغير ۔ (۲)

فقہی اعتبار سے اشتہارات حاصل کرنا اجارہ کی شکل ہے، اشتہار دینے والا آجر ہے اور یہ مستأجر، اور تشہیر وہ منفعت ہے جس کا اجارہ کیا جا رہا ہے۔

(ج) اشتہارات کو دیکھنا اور اس کا معاوضہ لینا۔

(د) اشتہارات پر کلک کرنا اور اس پر معاوضہ لینا۔

یہ دونوں صورتیں درست نہیں ہوں گی؛ اس لئے کہ اجارہ کے درست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز اُجرت پر لی جا رہی ہے، وہ اسی مقصد کے لئے لی جائے، جس کے لئے وہ وضع کی گئی ہے:

حتیٰ لو استأجر ثيابا أو أواني ليتجمل بها أو دابة ليجنبها بين يديه أو دارا لا ليكسنها أو عبدا أو دراهم أو غير ذلک لا ليستعمله بل ليظن الناس أنه له فالاجارة فاسدة في الكل ، ولا أجر له لأنها منفعة غير مقصودة من العين ۔ (۳)

---

(۱) اعلام الموقعین: ۳/۱۷۱۔ (۲) الموافقات: ۱/۱۷۹۔ (۳) الاختیار شرح المختار: ۲/۶۔

اشتہار کا مقصد یہ ہے کہ جس سامان کی تشہیر کی جا رہی ہو، اس کو لوگ خریدیں، نہ کہ وہ صرف دیکھیں، یا اشتہار پر کلک کریں؛ اس لئے اس کو درست نہیں ہونا چاہئے، نیز اس میں دھوکہ کا بھی پہلو ہے؛ کیوں کہ اشتہار کو دیکھنے اور بار بار کلک کرنے کا مقصد یہ تأثر دینا ہے کہ اس کو بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے، اور یہ ایک طرح سے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش ہے، فقہی اعتبار سے یہ اجارہ فاسدہ ہے۔

آن لائن اشتہارات کے لئے مشہور ویب سائٹوں کے مرکزی صفحہ پر موجود جگہ خرید کرنا اور اس پر اپنی مصنوعات کا اشتہار لگانا جائز ہے؛ بشرطیکہ جن مصنوعات کا اشتہار لگایا جائے، وہ خود جائز ہوں؛ کیوں کہ یہ اجارہ کی شکل ہے، متعلقہ کمپنیوں نے ایک مخصوص مدت کے لئے جگہ کرایہ پر حاصل کی ہے؛ اس لئے فقہی اعتبار سے یہ اجارہ کے دائرہ میں آئے گا۔

البتہ کم کرایہ پر لے کر زیادہ کرایہ پر لگانے کا مسئلہ قابل غور ہے، حنفیہ کے نزدیک جتنے کرایہ پر اس نے حاصل کیا ہے، اس سے زیادہ پر دوسرے شخص کو کرایہ پر دینا درست نہیں، اور جو زائد پیسہ ہو، وہ اس کے لئے طیب نہیں ہوگا، سوائے اس کے کہ پہلے مستأجر نے اس شئے میں کوئی اضافہ کیا ہو، یا دونوں کرایوں کی جنس الگ الگ ہو۔

مالکیہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس شخص کا دوسرے کو زیادہ کرایہ پر دینا جائز ہے، بظاہر حنفیہ اور دوسرے فقہاء کے درمیان ایک بنیادی اختلاف ہے، اور وہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک منفعت مال نہیں ہے؛ لہٰذا جیسے اعیان کو خرید کر زیادہ قیمت پر بیچنا جائز ہے، ویسے ہی منافع کو خرید کر زیادہ قیمت پر بیچنا جائز نہیں ہوگا؛ جب کہ دوسرے فقہاء کے نزدیک منافع کو بھی مال شمار کیا گیا ہے؛ لہٰذا منفعت خرید کر اس کو زیادہ قیمت میں فروخت کرنا درست ہوگا :

> أحدهما للحنفية : وهو أن المنافع ليست أموالا منقولة فى حد ذاتها ؛ لأن صفة المالية للشئى إنما تثبت بالتمول ، والتمول يعنى صيانة الشئى وادخاره لوقت الحاجة ، والمنافع لا تبقى زمانين لكونها أعراضا .... والثانى لجمهور الفقهاء من الشافعية والمالكية والحنابلة وهو أن المنافع أموال بذاتها ؛ لأن الأعيان لا تقصد لذاتها بل لمنافعها وعلى ذلک أعراف الناس ومعاملاتهم ۔ (۱)

لیکن موجودہ دور کے اسلامک فائنانس کے ماہر علماء واصحابِ افتاء نے کم کرایہ پر لے کر زیادہ کرایہ پر دینے کو عمومی طور پر جائز قرار دیا ہے، اور اُن میں فقہاء احناف بھی شامل ہیں؛ چنانچہ ’’هيئة المحاسبة

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۶۳ / ۲۳۔

والمرابحة للمؤسسات المالية الاسلامية بحرين'' جوموجودہ دور میں اسلامک فائنانس کا سب سے بڑاادارہ ہے،اس نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ ''المعایير الشرعية'' مرتب کیا ہے،جس کے چیر مین حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ہیں،اس میں کہا گیا ہے :

يجوز لمن استأجر أن يؤجرها لغير المالک بمثل الأجرة أو بأقل أو بأكثر بأجرة حالة أو موجلة (وهو ما يسمى التأجير من الباطن) مالم يشترط عليه المالک الامتناع عن الايجار للغير أو الحصول على موافقة منه ۔ (۱)

اسی طرح ''برکہ کمپنی'' جواقتصادی مسائل سے متعلق فتاویٰ کوخاص طور پر شائع کرتی ہے،اس کی قرارداد نمبر:۳۷ اس طرح ہے :

يجوز استئجار شيئ بأجرة معينة وتأجيره للغير بمثل ما استؤجر به أو أكثر أو أقل ما لم يمنعه المؤجر الأول أو العرف ۔ (۲)

اورخود فقہ حنفی کے مطابق بھی اس کے جواز کی شکل نکل سکتی ہے ؛ کیوں کہ گوگل اپنی اجرت ڈالر سے متعین کرے گا اور دوسرے ملکوں کی کمپنیاں اس مخصوص جگہ کواپنے ملک کی کرنسی مثلاً روپیہ کے بدلہ کرایہ پر حاصل کریں گی ، نیز موجودہ دور میں علماء نے ہر ملک کی جنس کو مستقل کرنسی شمار کیا ہے ؛اس لئے دونوں اُجرتوں کی الگ الگ جنس ہوئی اور حنفیہ کے نزدیک بھی جب دونوں اُجرتوں کی جنس الگ ہوں تو پہلے کرایہ دار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اپنے دوسرے کرایہ دار سے پہلے کرایہ کے مقابلہ زیادہ کرایہ نہ لے۔

لباس کے ذریعہ تشہیر

مشاہیر کے لباس پر نام یا لوگو کے ذریعہ تشہیر دو شرطوں کے ساتھ جائز ہوگی :

(الف) جس چیز کی تشہیر کی جارہی ہے، وہ خود مباح ہو۔

(ب) جس چیز پر تشہیر کی جارہی ہے، وہ بھی ایک جائز ذریعہ ہو۔

لہٰذا نہ کسی ناجائز چیز کی تشہیر جائز ہوگی کہ یہ گناہ کی طرف دعوت دینا ہے، اور تعاون علی الاثم والعدوان میں شامل ہے، اور نہ غلط ذریعۂ تشہیر جائز ہے ؛اس لئے فلمی دنیا کے لوگوں کے لباس پر اشتہار کے لئے نام وغیرہ طبع کرنا یا فلمی پروگراموں میں تشہیر کو شامل کرنا جائز نہیں ہوگا ؛ کیوں کہ اس صورت میں ایسی جگہ کا تشہیر کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، جو واضح طور پر گناہ اور برائی کا عمل ہے۔

(۱) المعایير الشرعية:۱۵۳،معیار نمبر:۹ فقرہ نمبر:۳/۳۔ (۲) فقه المعاملات:۳/۳۱۱۔

(۶) مختلف موبائل ایپس کی سہولیات سے نفع اُٹھانے کے لئے ای والٹ، یا ''ڈیجیٹل والٹ'' کی جو صورتیں لکھی گئی ہیں، ان کے ذریعہ واجبات کوادا کرنا درست ہے؛ چوں کہ یہ کمپنیاں خود سامان نہیں بیچتی ہیں، یا خدمت فراہم نہیں کرتی ہیں، اگر یہ خود سامان فروخت کرتیں تو اس چھوٹ کو''في حط الثمن'' کہا جاسکتا تھا، اور اگر یہ خود خدمت فراہم کرتیں تو اس چھوٹ کو''حط في الأجرة'' قرار دیا جاسکتا تھا؛لیکن سوال سے ظاہر ہے کہ ایپ والوں کی طرف سے تشجیعی طور پر یہ چھوٹ دی جاتی ہے؛ تاکہ ان کے ایپ کوزیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل ہو، اور ہوسکتا ہے کہ ان کو اصل بائع یا آجر کی طرف سے یہ سہولت رقم پہنچانے پر کچھ اجرت بھی ملتی ہو؛ اس لئے اس صورت کوانعام قرار دینا بہتر ہے؛ کیوں کہ انعام کسی بھی دینی یا دنیوی جائز عمل پر دیا جاسکتا ہے، اور اس کا قبول کرنا درست ہے؛ کیوں کہ یہ ازقبیل ہبہ ہے :

الأصل إباحة الجائزة على عمل مشروع سواء أكان دينيا أو دنيويا ؛ لأنه من باب الحث على فعل الخير والإعانة عليه بالمال ، وهو من قبيل الهبة ـ (۱)

موبائل اپلیکیشن کے ذریعہ ٹیکسی کرایہ پر لینا

اس میں دوعقد پائے جاتے ہیں، ایک عقد کمپنی اور گاڑی مالکان کے درمیان کہ کمپنی ان سے گاڑی اُجرت پر حاصل کرتی ہے، دوسرا عقد مسافر اور کمپنی کے درمیان ہے کہ پسنجر کمپنی سے منزل تک پہنچانے کی خدمت حاصل کرتا ہے، اور اس کی اُجرت ادا کرتا ہے، یہ دونوں ہی شکلیں اجارہ کی ہیں، پہلی شکل اجارہ علی العین کی ہے کہ کمپنی مالکان سے گاڑی کرایہ پر حاصل کرتی ہے، اور دوسری شکل ''اجارہ علی الخدمت'' کی ہے، اور یہ دونوں باتیں جائز ہیں؛ اس لئے اس طرح کرایہ پر معاملہ طے کرنے اور پسنجر کا اس میں سواری کرنا جائز ہوگا، رہ گئی اُجرت میں ایک درجہ کی جہالت، تو یہ اس عقد کے لئے مضر نہیں ہے؛ کیوں کہ ہر جہالت صحت عقد میں مانع نہیں ہوتی، ایسی جہالت مانع ہے جو نزاع کا سبب بنتی ہو، خواہ معاملہ بیع کا ہو یا اجارہ کا، خود قرآن مجید میں اس کا اشارہ موجود ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اُجرت رضاعت کے سلسلہ میں فرمایا: ''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (البقرۃ: ۲۳۳) فقہاء نے مختلف جگہوں پر جہالت کے مفسد عقد ہونے کے لئے مفضی الی النزاع ہونے کی شرط لگائی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس درجہ کی جہالت نہ ہو کہ وہ مفضی الی النزاع ہو، تو وہ معاملہ کی صحت میں مانع نہیں، علامہ شمس الدین فناری (م: ۸۳۴ھ) فرماتے ہیں :

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: ۷۷/۵۔

ولأن الجهالة فيه غير مفضية الى النزاع اذ العادة جرت بالتوسعة على الآظأر شفقة على الصغار ۔ (۱)

علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ نے جہالت کے سلسلہ میں متعدد مواقع پر دو نکات اُٹھائے ہیں، ایک یہ کہ جو جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہوتی، وہ صحت عقد میں مانع نہیں ہے، دوسرے: یہ حکم بطور قضاء کے ہے، جب معاملہ قاضی کے پاس جائے تو وہ ایسی جہالت کی وجہ سے فساد عقد کا فیصلہ کرے گا، یہ حکم بطور دیانت کے نہیں ہے؛ لہٰذا اگر اس طرح کا معاملہ ہو جائے، کوئی نزاع پیدا نہیں ہوا اور معاملہ قاضی کے پاس نہیں گیا تو عقد درست ہو جائے گا۔

اسی لئے حالاں کہ عقد بیع میں کوئی بھی ایسی شرط لگائی جائے، جس میں عاقدین یا مطالبہ کی صلاحیت رکھنے والے معقود علیہ کا نفع ہو تو یہ بیع فاسد ہوتی ہے؛ مگر فقہاء صراحت کرتے ہیں: ''إلا أن يكون شرطاً متعارفاً'' کیوں کہ جو شرط معروف ہو جاتی ہے، وہ نزاع کا باعث نہیں بنتی، گاڑی مالکان اور ڈرائیور کو جو بونس دیا جاتا ہے، یہ انعام کے قبیل سے ہے اور اس میں کوئی شرط لگانا مثلاً یہ کہ ایک سو پچھتر رائیڈ کر لے تو ۸ / ہزار دیئے جائیں گے، جائز ہے، یہ جُعالہ کے حکم میں ہے؛ چنانچہ جعالہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: ''هي جعل مال معلوم لمن يعمل له عملاً مباحاً''۔(۲)

چوں کہ کمپنی اور گاڑی مالکان، نیز پیسنجر اور کمپنی دونوں کے درمیان پائے جانے والا اجارہ جائز ہے؛ اس لئے پیسنجر کا اس سے استفادہ کرنا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

فرنچائز کا شرعی حکم

فرنچائز کی خرید وفروخت سے متعلق مسئلہ دراصل مال کی حقیقت اور جن حقوق سے مالی منفعت متعلق ہو گئی ہو، ان کی خرید وفروخت کے جواز وعدم جواز پر مبنی ہے، اس موضوع پر اس حقیر کا مقالہ ''مال کی حقیقت اور حقوق کی خرید وفروخت'' (۳) میں شامل ہے، نیز اسی کتاب میں صفحہ: ۱۲۹-تا-۱۵۴ پگڑی کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے، اس میں بھی اس موضوع کی بعض باتیں آگئی ہیں، اس بحث کا خلاصہ اور خاص کر فرنچائز پر حکم فقہی کی تطبیق کے سلسلہ میں یہ مختصر نوٹ پیش کیا جاتا ہے :

انسان جن چیزوں سے استفادہ کرتا ہے، وہ بنیادی طور پر تین قسم کی ہیں: اعیان، منافع اور حقوق، اعیان تو وہ ہیں جن کا مادی وجود پایا جاتا ہو، اگر یہ مباح شئے ہو تو اس کی خرید وفروخت کا جائز ہونا، کتاب اللہ، سنت رسول،

(۱) فصول البدائع فی اصول الشرائع: ۲/۱۹۵۔ (۲) موسوعۃ الفقہ الاسلامی: ۳/۵۴۴۔

(۳) جدید فقہی مسائل: ۴/۱۵۷-۱۹۔

آثارِ صحابہ سے ثابت ہے اور اس پر اُمت کا اجماع ہے، منافع سے مراد وہ نفع ہے جو اعیان سے حاصل ہوتا ہے، جیسے: مکان میں سکونت، گاڑی پر سواری، مزدور کا عمل وغیرہ، اس پر تو اتفاق ہے کہ منافع کا عوض لینا جائز ہے؛ لیکن احناف کے نزدیک یہ عوض اجارہ کی بنیاد پر ہے، یہ خود مال نہیں ہے، دیگر فقہاء کے نزدیک منافع کو بذاتِ خود مال کا درجہ حاصل ہے؛ اسی لئے احناف کے یہاں اجارہ ایک عارضی عمل ہے؛ لیکن شوافع کے نزدیک کسی چیز کا حق انتفاع ہمیشہ کے لئے بھی خریدا اور فروخت کیا جا سکتا ہے: ''**البیع عقد معاوضة مالیة تفید ملک عین أو منفعة علی التأبید**''(۱) لیکن بہرحال بنیادی طور پر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ منافع کا عوض لیا جا سکتا ہے۔

تیسری چیز جس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، وہ ''حق'' ہے، حقوق کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: ایک وہ حقوق جو دفع ضرر کے لئے ہوں، جیسے: حق شفعہ یا خیارِ رؤیت وغیرہ، یہ قابلِ عوض نہیں ہیں، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے، دوسری قسم کے حقوق وہ ہیں، جن سے جلبِ منفعت ہوتی ہے، یہ مال ہوں گے یا نہیں؟ اس میں وہی اختلاف ہے جو اختلاف منافع کے مال ہونے کے بارے میں ہے، جمہور نے مال کی جو تعریف کی ہے، اس کے لحاظ سے یہ مال میں شامل ہیں؛ اس لئے ان کے نزدیک حقوق کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے، حنفیہ کے نزدیک مال کی دو طرح کی تعریفیں کی گئی ہیں، بعض تعریف میں مادی ہونے کی شرط لگائی گئی ہے؛ چنانچہ شیخ مصطفی زرقاء نے اس سلسلہ میں مختلف علماءِ حنفیہ کی تعریف کو سامنے رکھ کر کہا ہے: ''**المال هو کل عین ذات قیمة مادیة بین الناس**''(۲) لیکن بعض ایسی تعریفیں بھی کی گئی ہیں، جس کے عموم میں حقوق بھی شامل ہیں، جیسے علامہ حصکفیؒ کا بیان ہے: ''**ما من شأنه أن ترغب الیه النفس**''(۳) غرض کہ بعض تعریفات میں بہت عموم ہے اور بعض میں عین ہونے کی شرط لگائی گئی ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ متاخرین احناف نے بعض حقوق و منافع کو مال تسلیم کیا ہے، یا اس کو مال کے درجہ میں رکھا ہے، جیسے مہر منافع کے ذریعہ مقرر کرنا؛ حالاں کہ **تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ** (النساء: ۲۴) سے ظاہر ہے کہ مہر کا مال ہونا ضروری ہے، یا حق مرور، حق شرب، حق تعلّی وغیرہ کی بیع؛ چنانچہ ظاہر روایت کے مطابق تنہا حق شرب کی بیع جائز نہ ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ بابرتیؒ لکھتے ہیں کہ اس کا جائز نہ ہونا جہالت کی وجہ سے ہے، اس وجہ سے نہیں کہ حق شرب مال نہیں ہے :

> **إنما لم یجز بیع الشرب وحده فی ظاهر الروایة للجهالة لاباعتبار أنه لیس بمال۔** (۴)

---

(۱) تحفۃ المحتاج: ۴/ ۵۱۲۔ (۲) المدخل الفقہی العام: ۳/ ۸۱۱۔

(۳) ردالمحتار: ۷/ ۱۰۔ (۴) عنایہ: ۵/ ۴۰۲۔

پھراس کی تاویل کی گئی ہے کہ چوں کہ یہ منافع عین سے متعلق ہیں، اور عین مال ہوتا ہے؛ اس لئے یہ بھی مال کے حکم میں ہوں گے۔

غور کیا جائے تو مال کی قرآن وحدیث میں کوئی تعریف نہیں کی گئی ہے؛ کیوں کہ یہ ایک معروف لفظ ہے، ہر شخص پر اس کا مفہوم واضح تھا، اور جن چیزوں کی تعریف نہ قرآن وحدیث میں مصرح ہو اور نہ لغت میں حدود وقیود کے ساتھ اس کا کوئی معنی متعین ہو تو اس کا مفہوم عرف کے ذریعہ متعین ہوتا ہے؛ چنانچہ فقہی قاعدہ ہے :

کل ما ورد به الشرع مطلقاً ولا ضابط له فيه ولا فى اللغة يرجع فيه الى العرف ۔ (۱)

بظاہر متقدمین احناف کا مال میں عین ہونے کی شرط لگانا بھی اسی پر مبنی ہے کہ اس زمانہ میں اعیان ہی کو مال تصور کیا جاتا رہا ہوگا؛ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی فرماتے ہیں :

واختلفت أقوال المشائخ فى حق الشرب ، فمنعه بعضهم لكونه حقاً مجرداً وجوّزه بعضهم بحكم العرف ، وهذا يدل أن للعرف مجالاً فى ادراج بعض الحقوق والمنافع فى الأموال ، ويقول ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : والمالية تثبت تمول الناس كافة أو بعضهم ، والتقوم يثبت بها ، وباباحة الانتفاع به شرعاً ۔ (۲)

اوراسی بنیاد پر موجودہ عرف کے تحت مولانا کی رائے ہے کہ اس دور میں ائمہ ثلاثہ کا قول قابل ترجیح ہے: ''فالأخذ بقول الأئمة الثلاثة أولى '' (۳) ہمارے اکابر علماء میں حضرت تھانویؒ نے ''گلشن ادب'' یا ''عطرستان'' کا نام استعمال کرنے کے عوض کو جائز قرار دیا ہے، فرماتے ہیں :

اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے؛ لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام ''عطرستان'' یا ''گلشن ادب'' رکھ لیا اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہوگیا تو دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا، اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز ہے۔(۴)

چنانچہ اسلامک فائنانس سے متعلق تحقیق اور فقہی تکییف کا سب سے معتبر ادارہ ''هيئة المحاسبة

(۱) الاشباہ للسیوطی:۱۹۱۔ (۲) فقہ البیوع:۱/۹۶۲۔ (۳) فقہ البیوع:۱/۹۶۲۔ (۴) امدادالفتاویٰ:۳/۲۱۔

والمراحبة للمؤسسات المالية الاسلامية بحرين''جس میں پورے عالم اسلام کے نمائندہ علماء شامل ہیں، نے اس سلسلہ میں جوفیصلہ کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے :

اذا حد المقابل عن منع امتیاز الادارة بمبلغ مقطوع أو بنسبة من اجمالی الایراد فان العقد بین الدولة وصاحب الامتیاز عقد اجارة ، وفی هذه الحالة یحق للجهة المانحة لامتیاز الارادة تحصیل رسوم عن منع الامتیاز وتکون من قبیل الأجرة المقدمة ، بالاضافة الی المقابل المستحق عن مدة الامتیاز ۔ (۱)

پس فرنچائز بھی ایسے حقوق میں ہے، جن کی خرید وفروخت ہوسکتی ہے؛ لہٰذا :

(۱) فرنچایز کا بیچنا بھی جائز ہے اور خریدنا بھی؛ بشرطیکہ حلال کاروبار کی فرنچایز ہو؛ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ اگر خریدار کو سامان تیار کرنے کی اجازت دی جائے تو اس کو پابند کیا جائے کہ وہ اصل کمپنی کے معیار کو پورا کرے اور حسبِ ضرورت اس کی نگرانی بھی کی جائے؛ ورنہ یہ صارفین کے ساتھ دھوکہ ہوگا۔

(۲) اگر کسی کو ہمیشہ کے لئے فرنچائز فروخت کردی جائے تو یہ بیع ہے، اور اس پر بیع کے احکام جاری ہوں گے، اور اگر ہمیشہ کے لئے اس کو مالک نہیں بنایا گیا، صرف ایک مدت کے لئے اس سے استفادہ کا حق دیا گیا تو یہ اجارہ ہے، اگر ایک ساتھ لگی بندھی رقم دے دی جائے، یا قسطوں میں دی جائے تو دونوں اُجرت کے حکم میں ہے، اگر چہ اس دوسری صورت میں ایک گونہ جہالت پائی جاتی ہے؛ لیکن تجربہ ہے کہ یہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہوتی؛ اس لئے یہ قابل تحمل ہے۔

اور اگر حاصل ہونے والے نفع میں ایک تناسب مقرر کیا جائے تو یہ مضاربت کی شکل ہے، اور فرنچائز والے نے جو اپنے حق سے استفادہ کی اجازت دی ہے، یہ ''رأس المال'' تصور کیا جائے گا، اگر چہ حنفیہ کے یہاں رأس المال کا نقد کی شکل میں ہونا ضروری ہے؛ لیکن بعض اور فقہاء کے نزدیک اشیاء کو بھی مضاربت میں رأس المال بنایا جاسکتا ہے، اور آج کل مصارف اسلامیہ کے ماہرین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے؛ اسی لئے معاییر شرعیہ کا فیصلہ کرنے والے حضرات نے اس صورت کو مضاربت قرار دیا ہے :

و إذا حدد المقابل بنسبة من الأرباح (صافی الإیراد بعد المصروفات والمحصنات) فإن العقد بین الدولة وصاحب الإمتیاز عقد مضاربة ، رأس مالها هو أصل المرفق أو المشروع ۔ (۲)

(خالد سیف اللہ رحمانی)

● ● ●

(۱) المعاییر الشرعیة: ۸۲۳۔ (۲) المعاییر الشرعیة: ۸۲۳۔

خسرہ اور روبیلا (Measles & Rubela) ویکسین
تاریخی پس منظر اور شرعی نقطۂ نظر

مفتی محمد اشفاق قاضی ☆

آج کل خسرہ اور روبیلا سے متعلق نو ماہ سے لے کر پندرہ سال تک کی عمر کے بچوں کو ویکسین یعنی ٹیکے دیئے جانے کے سلسلہ میں مختلف معلومات، متضاد بیانات اور منفی ومثبت رجحانات کی بناء پر ایک عام مسلمان بہت ہی زیادہ تذبذب کا شکار ہے، مسلمانوں کو یہ ویکسین اپنے بچوں کو دلانا چاہئے یا نہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جو بحث وتحقیق اور ریسرچ کا طالب ہے، پھر یہ ویکسین دیا جانا نفع بخش ہے یا مضرت رساں؟ اور شرعی اُصول وضوابط اس بارے میں کیا کہتے ہیں، یعنی آسان الفاظ میں یہ ویکسین لیا جانا جائز ہے یا نہیں؟

- درج ذیل مضمون میں اولاً ویکسین کیا ہے؟
- اس کی ایجاد کس نے کی؟
- کب اور کیوں؟
- ویکسین کی کتنی قسمیں ہیں اور کن کن بیماریوں میں یہ دیا جاتا ہے؟
- اور اس کے فوائد ومضرات کیا ہیں؟
- ان سوالات کے جوابات اور پھر اخیر میں شرعی نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب اس دنیا کے پیدا کئے جانے اور بنائے جانے کا ارادہ فرمایا، اس سے پہلے انسانوں کا کوئی وجود اس کائنات میں نہیں تھا، فرشتے موجود تھے، جن سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ (البقرۃ:۳۰)

وہ وقت قابل ذکر ہے کہ جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

☆ دارالافتاء والارشاد، جامع مسجد ممبئی۔

اور اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو خود اپنے ہاتھوں سے بنایا :

قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّۖ ۔ (ص:۷۵)

اللہ نے کہا: اے ابلیس! جس (آدم علیہ السلام) کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اس کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا ہے؟

اور حضرت آدم علیہ السلام ہی سے حضرت حوا علیہا السلام کو اور اس طرح نسل انسانی کو وجود بخشا، فرمانِ باری تعالیٰ ہے :

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفۡسٖ وَٰحِدَةٖ وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالٗا كَثِيرٗا وَنِسَآءٗۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ٱلَّذِي تَسَآءَلُونَ بِهِۦ وَٱلۡأَرۡحَامَۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيبٗا ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو اک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تم لوگوں پر نگراں ہیں۔

اور پھر ایک خاص واقعہ کے نتیجہ میں دنیا وجود میں آئی، اس طرح دنیا میں انسانوں کی پرورش و پرداخت بڑھتی چلی گئی، اولِ دن سے انسان کے ساتھ اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے، کپڑے لتے کی ضروریات موجود تھیں، شکلیں یقیناً مختلف رہیں، پھر جیسے جیسے دور بڑھتا اور آگے چلتا گیا، کپڑوں کے انداز واطوار، کھانوں کے انواع واقسام، اسی طرح رہائشی مکانات کے طور وطریقے بھی تبدیل ہوتے چلے گئے اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ یہ تمام اُمور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آج ایک خاص مرحلہ تک پہنچ چکے ہیں، سو دو سو سال پہلے تک بھی آج کی طرح سو سو منزلہ فلک بوس عمارتوں پر گفتگو کرنا یا آج کے موجود مختلف غذا کے حصول یا اس کے بنانے کے طریقہ پر بات کرنا جنات و پریوں کی کہانی اور تصوراتی دنیا کے خیالات سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا، گویا یہ یقینی بات ہے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے سے لے کر آج تک دنیا مختلف مراحل میں بڑھتی اور ترقی کرتی چلی آرہی ہے، (ہاں! یہ اور بات ہے کہ یہ ترقی کتنی مفید یا مضر ہے؟ اور اس سے استفادہ کس حد تک کیا جانا چاہئے، ان حدود کی تعیین اور حد تجاوزی کے نقصانات ایک مستقل موضوع ہے)؛ البتہ یہ طے شدہ بات ہے کہ گذشتہ سو دو سو سال میں دنیا کے مختلف میدانوں میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے، اسی کو صنعتی انقلاب یا سائنسی انقلاب بھی کہا جاتا ہے؛ لہٰذا علاج ومعالجہ بھی مرحلہ وار آگے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آج کے سائنسداں یہ غور کرنے لگے کہ DNA اور انسانی سیل کے

ذریعہ ایک مکمل کے سارے اعضاء مصنوعی طریقہ سے بنا کر اس کے دماغ کو حقیقی جسم کی کھوپڑی سے نکال کر مصنوعی جسم میں منتقل کیا جاسکتا ہے، حقیقت میں یہ ممکن ہے یا نہیں؟ کیا کوئی کر چکا ہے، یا نہیں؟ اس کا علم راقم کو نہیں؛ لیکن اوپن سرجری (Open Heart Surgery) جوائنٹ ریپلیسمینٹ سرجری (Joint Replacement Surgery)، اعضاء کی پیوند کاری (Organ Transplantation) بون میاروا ور لیور ٹرانسپلینٹ (Bonw Marrow & Liver Transplant) وغیرہ تو بہت ہی عام بات ہو چکی ہے، جس کا تصور بھی چند دہائی قبل ایک خواب تھا، علاج و معالجہ کا یہ نظام بھی مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے، اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ پہلے دور میں ایسے ترقی یافتہ علاج و معالجہ کے طریقے نہیں تھے، تو ساتھ ہی بیماریاں بھی بہت کم تھیں اور آج جس طریقے سے ادویہ مختلف قسم کے آپریشن اور متنوع و متعدد طریقۂ علاج رائج ہیں، وہیں بے شمار نئی بیماریاں بھی سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

علاج و معالجہ میں عام طور پر ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، یونانی اور چینی طریقے بہت مشہور ہیں، ایک دور حکمت اور حکماء کے عروج کا ایسا گذرا ہے کہ بعض حکیم کلائی پر پھڑکتی رگ اور نس پر اپنی انگلی رکھ کر نہ صرف بیماری بتلا دیتے: بلکہ اس حد تک بتلا دیتے کہ یہ بیماری کس بات کی وجہ سے ہوئی ہے اور مریض نے کس چیز کا استعمال کتنی مقدار میں اور کس وقت کیا ہے؟ حضرت لقمان حکیم کی حکمت تو مشہور و معروف ہے کہ آپ جڑی بوٹیوں، درخت کے شاخوں، پتوں اور جڑوں سے مختلف بیماریوں کی دوائیں بنایا کرتے تھے، زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر چہ تمام دیگر طریقۂ علاج میں بھی یقیناً ترقی ہوئی؛ لیکن جو عروج اور مقبولیت ایلوپیتھی یا ماڈرن میڈیسن کو ہوئی، وہ ہر کس و ناکس پر عیاں و بیاں ہے۔

ایلوپیتھی (انگریزی) طریقۂ علاج کے موجد عام طور پر یورپ اور انگریز سائنسداں کو سمجھا جاتا ہے، جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ایلوپیتھی اور جدید طریقۂ کی اصل بنیاد بھی یونانی طریقۂ علاج ہی ہے، جس کا باوا آدم بقراط (Hippo Crates) کو مانا جاتا ہے، اطباء و حکماء اور ڈاکٹروں کے لئے جو اخلاقی پابندیوں کا عہد نامہ مرتب کیا گیا ہے وہ بھی بقراط ہی کا وضع کردہ ہے، اسی لئے اسے ''عہد نامہ بقراط'' (Hippo Cratice Oath) کہا جاتا ہے، ایلوپیتھی اور جدید طریقۂ علاج میں استعمال ہونے والی دوائیں، سرجری کے آلات، آپتھلمولوجی وغیرہ کے سلسلہ میں آج بھی ابوزکریا الرازی (۸۶۴-۹۲۵)، ابوالقاسم الزہراوی (۹۳۶-۱۰۱۳)، ابن الہیثم (۹۶۵-۱۰۴۰) اور بوعلی سینا (۹۸۱-۱۰۳۷) جیسے بہت سے مسلمان اطباء و حکماء بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایم بی بی ایس (M.B.B.S) کی بنیادی کتاب ''القانون'' جسے انگریزی میں (The Canon of

(Medicin لکھا جاتا ہے، وہ بوعلی سیناہی کی محنت وجدوجہد کا خلاصہ ہے، ابوالقاسم الزہراوی کی ''کتاب التصریف'' اس طریقۂ علاج کا انسائیکلو پیڈیا مانا جاتا ہے، پھر زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا اور ترقی کرتا گیا، فن طب میں بھی ترقی ہوتی چلی گئی اور تخصصات (سپلائزیشن Specialazation) کے بے شمار شعبہ جات بنتے چلے گئے، کچھ عرصہ پہلے تک عام طور پر جی پی (Genrel Fisition) کو سب کچھ سمجھا جاتا تھا اور تمام بیماریوں میں ہر قسم کی دوائیں ان ہی سے حاصل کی جاتی تھی، پھر آنکھوں کا معالج الگ، کانوں کا طبیب علاحدہ، دل ودماغ کا مستقل ڈاکٹر؛ بلکہ جسم کے ایک ہی عضو مثلاً آنکھ یا کان یا دل ودماغ کے مختلف حصوں یا مختلف امراض کے علاحدہ علاحدہ ڈاکٹر پائے جانے لگے، بیماریوں کی تشخیص کے لئے پیتھالوجی، بیکٹر یولوجی، مائیکرو بائیلوجی اور وائیرولوجی کے شعبہ جات نے ایک عظیم ترقی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی، ان ہی میں ایک طریقۂ علاج ''ویکسی نیشن'' کا ہے۔

ویکسی نیشن کے سلسلہ میں ہم پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے جسم کا مدافعتی نظام کیا ہے؟ اور کیسے کام کرتا ہے؟

ویکسن کو جاننے کے لئے ہمیں ہمارے جسم میں پائے جانے والے مدافعتی نظام (Immune System) کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے، مدافعتی نظام مخصوص خلیات، لحمیات (پروٹین)، بافتوں اور اعضاء پر مشتمل ہوتا ہے جو ہمیں مختلف بیماریوں اور جراثیم سے محفوظ رکھتا ہے، یہ ہمارا مدافعتی نظام سلسلہ وار طریقے سے کام کرتا ہے، جسے مدافعتی ردِعمل (Immune Response) کہتے ہیں، یہاں ہمیں دو اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے :

(۱) ایک اینٹی جن (Antigen)، کوئی بھی بیرونی چیز یا جراثیم جو جسم کا حصہ نہ ہو، اسے اینٹی جین کہتے ہیں۔

(۲) دوسرے اینٹی باڈیز (Anti-bodies)، جب مذکورہ اینٹی جین جسم میں داخل ہوتا ہے تو جسم کا مدافعتی نظام اس کے خلاف ایک پروٹین بناتا ہے، جسے اینٹی باڈیز کہتے ہیں۔

مدافعتی نظام کی تین طرح سے درجہ بندی اور قسمیں کی جاتیں ہیں اور ہر قسم دو شکلوں پر مشتمل ہوتی ہے :

(۱) پیدائشی مدافعتی نظام، جو پیدائشی طور پر ہر انسان کے جسم میں پایا جاتا ہے، یہ بیماریوں کے خلاف ردِ عمل کے طور پر کام کرتا ہے، اس مدافعتی نظام کی دو شکلیں ہیں: (الف) پیدائشی عام مدافعتی نظام، (ب) پیدائشی خاص مدافعتی نظام ہیں :

(الف) پیدائشی عام مدافعتی نظام (Innate Immune System) ایک غیر مخصوص مدافعتی نظام ہے اور اس کا ردِعمل تمام جراثیم کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے۔

(ب) پیدائشی خاص مدافعتی نظام (Adaptive Immune System) ایک مخصوص مدافعتی نظام ہے، جس میں خاص اقسام کے خلیات مخصوص جرثوموں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم یا دوسرا اندازِ مدافعت رطوبتی اور خلیاتی ہوتا ہے :

(الف) رطوبتی مدافعت (Humoral Immunity) جن میں خود Anti-bodies شامل ہوتے ہیں، جو جسم کی جلد اور میوکس (بلغمی رطوبت جو کہ منہ، آنکھ، ناک اور پھیپھڑوں کی سطح پر پائی جاتی ہے) کے ذریعہ مدافعت کا کام انجام دیتے ہیں۔

(ب) خلیاتی مدافعت (Cell-mediated Immunity) جسم میں موجود خون کے خلیات کے ذریعہ مدافعت کا کام انجام دیتا ہے، یہ مدافعت مخصوص خلیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم یا تیسرا مدافعتی درجہ ''فعال مدافعت'' اور ''غیر فعال مدافعت'' ہے :

(الف) فعال مدافعت (Active Immunity) جس میں خون کے سفید خلیات بذاتِ خود جراثیم کے خلاف اینٹی باڈیز پیدا کرتے ہیں۔

(ب) غیر فعال مدافعت (Passive Immunity) اس میں جسم کے باہر سے اینٹی باڈیز داخل کی جاتی ہیں، جو جسم میں داخل ہو کر مدافعتی نظام کو حرکت میں لا کر فعال بناتی ہے۔

مدافعتی نظام کے اقسام، ان کے اجزاء اور ان کے کام کرنے کے طریقے جاننے کے بعد ہم جسم میں موجود خلیات میں سب سے پہلے اہم کردار خون کے سفید خلیات (Leukocytes) کا ہوتا ہے، ان خلیات کی پانچ قسمیں ہیں جو الگ الگ طریقوں سے مختلف اقسام کے افعال سرانجام دیتے ہیں، ان کے نام اور افعال درج ذیل ہیں :

۱- نیوٹروفل (Neutrophil): یہ خلیات Innate مدافعتی نظام کا حصہ ہوتے ہیں اور جسم میں جہاں کہیں بھی انفیکشن ہو، سب سے پہلے یہ خلیات اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور جراثیم کو ختم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

۲- لمفوسائٹ (Lymphocyte): ان خلیات کی مزید دو اقسام ہوتی ہیں :

(الف) B لمفوسائٹ جو اینٹی باڈیز پیدا کرتے ہیں۔

(ب) T لمفوسائٹ جو کہ انفیکشن زدہ خلیات کو پہچاننے اور ان کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، ان دونوں خلیات میں Memory خلیات بھی ہوتے ہیں، جو کہ جسم میں داخل ہونے والے جراثیم کی پہچان اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں اور دوسری بار انفیکشن کی صورت میں فوری ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔

۳- مونوسائٹ (Monocyte): یہ خلیات Innate اور Adaptive مدافعت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، ان کا کام جراثیم کو نگل کر ختم کرنا اور ان جراثیم کی معلومات کو دوسرے خلیات تک پہنچانا ہوتا ہے۔

۴- ایوزینوفل (Eosinophil): یہ خلیات الرجی اور طفیلیوں (Parasites) کے خلاف مدافعت پیدا کرتے ہیں۔

۵- بیزوفل (Basophil): یہ خلیات بھی الرجی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور ایسے اجزاء کا اخراج کرتے ہیں جو سوزش پیدا کرتے ہیں اور خون جمنے نہیں دیتے۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ویکسین کس طرح ہمارے مدافعتی نظام پر اثر انداز ہوتی ہے اور ویکسین کی کتنی قسمیں ہیں؟

ویکسین دراصل حیاتیاتی Preparation ہے، جو کسی مخصوص بیماری کے خلاف موافقتی (Adaptive) مدافعت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے، ویکسین میں بیماری پیدا کرنے والے وائرس اور بیکٹیریا کے اجزاء شامل ہوتے ہیں، جو دراصل خود جسم میں ایک قسم کا انفیکشن پیدا کرتے ہیں؛ لیکن اس سے مرض لاحق نہیں ہوتا؛ بلکہ اس سے بیماری کے خلاف جسم میں قوتِ مدافعت پیدا ہوجاتی ہے، یہ جسم میں داخل ہوکر T لمفوسائٹس اور اینٹی باڈیز پیدا کرتے ہیں، اس عمل میں جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھ سکتا ہے جو کہ ایک معمولی اثر ہے، ویکسی نیشن کے عمل کے بعد جسم میں B اور T لمفوسائٹس کے میموری خلیات پیدا ہوجاتے ہیں جو مخصوص وائرس یا بیکٹیریا کی شناخت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔

ہمارے جسم کا مدافعتی نظام بالکل ایسے ہی کام کرتا ہے، جیسے محافظ دستے جو ایک قلعے کی حفاظت کرتے ہیں، قلعہ دراصل خود ایک حفاظتی حصار ہوتا ہے، ہمارے جسم کی جلد اور میوکس (بلغمی رطوبت) جو کہ منہ، آنکھ، ناک اور پھیپھڑوں کی سطح پر پائی جاتی ہے، دراصل ایک حفاظتی قلعہ کا کام کرتی ہے، اسی طرح جسم میں خون کے خلیات محافظ دستے کے فرائض انجام دیتے ہیں، پھر جس طرح آرمی (Army) میں فوجیوں کے مختلف درجات ہوتے ہیں، اسی طرح خون کے خلیات کی بھی درجہ بندی ہوتی ہے اور ان کے افعال بھی ان کی ساخت کے مطابق تقسیم ہوتے ہیں، کچھ خلیات آرمی کے عام سپاہیوں (پیادہ فوج) کی طرح ہوتے ہیں جو فوری طور پر انفیکشن کی جگہ پہنچتے ہیں اور ان کا خاتمہ کرتے ہیں، کچھ خلیات حوالداروں (جنرل) کی مانند ہوتے ہیں، یہ تعداد میں کم ہوتے ہیں اور انفیکشن کو ختم کرنے میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے، پھر ان میں سے کچھ خلیات صرف انفیکشن پیدا کرنے والے جراثیم کی معلومات جمع کرتے ہیں اور انھیں مزید خاص قسم کے خلیات کو منتقل کرتے ہیں، جن کا کردار نیوی (Navy) اور فضائیہ فورس (Air Force) کی طرح کا ہوتا ہے، پھر یہ فوج اپنی پوری تیاری کے ساتھ انفیکشن کی جگہ پہنچتے ہیں اور اپنے مختلف ہتھیاروں سے ان کا خاتمہ کرتے ہیں، جب مکمل طور پر انفیکشن کا خاتمہ ہوجاتا ہے تو کچھ خلیات انفیکشن کی وجہ

بننے والے جراثیم کے بارے میں مکمل معلومات اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں، اس طرح کے معلومات محفوظ کروانے والے خلیات کی زندگی خاصی طویل ہوتی ہے، پہلی بار انفیکشن کی صورت میں مدافعتی نظام کو متحرک کرنے اور اس کا خاتمہ کرنے میں ایک سے دو ہفتوں کا وقت درکار ہوتا ہے؛ لیکن جب وہی جرثومہ دوسری بار جسم میں داخل ہوتا ہے تو جن خلیات کے پاس معلومات محفوظ ہوتی ہیں، وہ فوری طور پر اپنی تعداد میں اضافہ کر کے حرکت میں آ جاتے ہیں اور براہ راست نیوی اور ایئر فورس جیسے خلیات کو معلومات منتقل کرتے ہیں، جن کا ردعمل پوری تیاری کے ساتھ بہت جلد سامنے آتا ہے، دوسری بار انفیکشن کو ختم کرنے میں مدافعتی نظام کو ایک سے دو دن درکار ہوتے ہیں۔

ویکسین کی پانچ اقسام ہوتی ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱- Live/Attenuated ویکسین: اس ویکسین میں زندہ وائرس موجود ہوتے ہیں، جنھیں کمزور کر دیا جاتا ہے؛ تاکہ وہ بیماری پیدا کرنے کا باعث نہ بن سکیں، ان میں خسرہ، ممپس، روبیلا اور چکن پاکس کی ویکسین شامل ہیں۔

۲- Inactivated ویکسین: اس ویکسین میں مُردہ یا غیر فعال وائرس ہوتے ہیں، ان میں پولیو، ہیپاٹائٹس A ریبیز اور اور انفلوئنزا ویکسین شامل ہیں۔

۳- Toxoid ویکسین: اس ویکسین میں وائرس اور بیکٹیریا نہیں ہوتے؛ بلکہ ان سے خارج ہونے والے زہریلے مادے پائے جاتے ہیں، ان میں ٹیٹنس اور خناق کی ویکسین شامل ہیں۔

۴- Subunit ویکسین: اس ویکسین میں مکمل وائرس اور بیکٹیریا کے بجائے ان کے اجزاء ہوتے ہیں، ان میں DTP (خناق، ٹیٹنس اور کالی کھانسی) شامل ہیں۔

۵- Conjugate ویکسین: یہ ویکسین مختلف قسم کے بیکٹیریا کے خلاف استعمال کی جاتی ہے، ان بیکٹیریا کی بیرونی دیوار پر اینٹی جنز پائی جاتی ہیں، Hib ویکسین اس کی مثال ہے۔

اب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ خسرہ اور روبیلا (Measles & Rubela) کیا ہیں؟

خسرہ ایک نہایت متعدی مرض ہے جو پیرامائکسو وائریڈ فیملی (Paramyxoviridae Family) کے ایک وائرس کے ذریعہ لاحق ہوتا ہے، یہ براہ راست رابطے اور ہوا کے ذریعہ پھیلتا ہے، خسرہ کو Rubela بھی کہا جاتا ہے؛ لیکن اسے روبیلا کے ساتھ یا نام نہاد جرمن خسرہ کے مترادف نہیں سمجھنا چاہئے، خسرہ بہت سے ترقی پذیر مما لک میں بچوں کی موت کی ایک بڑی وجہ ہے، 2014ء میں دنیا بھر میں خسرہ کی وجہ سے 900,114 موتیں ہوئیں، جو کہ ہر گھنٹہ 13 موت کے برابر اور ہر دن 314 موت کے برابر ہے، خسرہ کے علامات میں بخار اور کھانسی

اوراس کے بدنام سرخ باد ہیں، یہ سرخ باد عام طور پر چہرے سے شروع ہوتے ہیں، اکثر بخار خسرہ کے سرخ باد سے پہلے آتا ہے؛ تاہم جب سرخ باد غائب ہوجائے تو بخار 104 فارن ہائٹ (40 ڈگری سیلسیس) یااس سے اوپر کے درجہ حرارت تک پہنچ جاتا ہے، یہ علامات عام طور پر خسرہ وائرس کے ساتھ انفیکشن کے بعد ایک سے دو ہفتوں میں شروع ہوتی ہیں، یہ بہت ہی متعدی بیماری ہے، وائرس متاثرہ مریضوں کی ناک اور گلے میں پایا جاتا ہے اور کھانسی اور چھینک کے ذریعہ ہوا میں چلا جاتا ہے، جہاں یہ دو گھنٹے تک فعال اور متعدی رہتا ہے، خسرہ وائرس سے متاثر شخص اگر کسی کمرہ میں سانس لے تو دو گھنٹے تک اس کمرہ میں اس کے اثرات موجود ہوتے ہیں اور دوسرا فرد دو گھنٹے کے اندر وہاں چلا جائے تو وہ اس بیماری سے متاثر ہوسکتا ہے، خسرہ کی وجہ سے مختلف شدت کی پیچیدگیاں لاحق ہوسکتی ہیں، ڈائریا (Diarrhea) سے لے کر انسیپ فلائٹس (Encephalitis) (دماغ کی سوجن) تک، بالغ مریضوں کو خاص طور سے زیادہ پیچیدگیاں لاحق ہوتی ہیں۔

روبیلا کی علامت بھی خسرہ جیسی ہوتی ہے، بخار آنا، ناک بہنا، کف اور جسم پر لال نشان پڑ جانا وغیرہ، یہ لڑکے یا لڑکی دونوں کو متاثر کرسکتا ہے، روبیلا کا انفیکشن چھوٹا ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس کی زد میں کوئی حاملہ خاتون حمل کے ابتدائی ایام میں آجائے تو اس کے خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں، کچھ بچے مردہ ہی پیدا ہوتے ہیں تو کچھ پیدائشی بہرے، نابینا، دماغی طور پر کمزور یا پھر دل میں سوراخ ہونے جیسی بیماریوں کی گرفت میں آجاتے ہیں، اسے خلقی روبیلا سنڈروم (Congential Rubella Syndrome) کہتے ہیں، جس کا اب تک کوئی علاج نہیں ہے، میڈیکل سائنس دانوں کی نظر میں ان بیماریوں سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ خسرہ روبیلا جیسے وائرس کو ختم کرنے کے لئے صد فیصد ٹیکہ کاری کے ہدف کو پورا کیا جائے۔

1941ء میں آسٹریلیائی آنکھوں کے ڈاکٹر گریگ نورمن (Greg Normen) کو سب سے پہلے اس بات کا احساس ہوا کہ پیدائشی بچوں میں موتیابند کی وجہ حمل کے دوران ان کے ماؤں کے روبیلا سے متاثر ہونا ہے، پھر مزید تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ خلقی روبیلا سنڈروم (Congenital Rubella Syndrome) سے بہرے پن، دل کی بیماری اور دماغ کی سوزش بھی ہوسکتی ہے، 1960ء کی نصف دہائی دنیا بھر میں روبیلا کی بیماری کے عروج کا زمانہ تھا، اس وقت یہ بیماری یورپ سے شروع ہوئی اور امریکہ تک پھیل گئی، اسٹینلی پلوٹکین (Stanley Plotkin) نے اپنے ریسرچ میں یہ بتلایا کہ فیلاڈلفیا (Philadelphia) کے امریکہ کے اسپتال میں پیدا ہونے بچوں میں ایک فیصد بچے خلقی روبیلا سنڈروم (Congenital Rubella Syndrome) سے متاثر تھے، کچھ صورتوں میں ایسا بھی ہوا کہ خواتین دورانِ حمل روبیلا سے متاثر تھی، انھوں نے کن جینی ٹل روبیلا سنڈ روم (Congenital Rubeaal

(Syndrome) کے خوف کی وجہ سے اپنے حمل کا اسقاط کروایا، اسٹینلی پلوٹکین (Stanley Plotkin) نے اسی طرح کے خاتون کے اسقاط حمل سے حاصل کردہ جنین پر ریسرچ کیا اور اس کے لئے مستقل ایک سائنس لیبارٹری وقف کی، ان کی اپنی تحقیق کے مطابق اسٹینلی پلوٹکین (Stanley Plotkin) نے اس جنین کے گردے کی جانچ کرتے ہوئے روبیلا وائرس معلوم کیا اور اس طرح اس بیماری کا پتہ لگایا گیا اور پھر ویکسین کے ذریعہ سے اس کا طریقۂ علاج نکالا گیا۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ویکسین کی ایجاد کب ہوئی؟ کس نے اور کیوں کی؟ اور اس وقت اس کا ردِعمل کیا ہوا؟

ویکسین کی ایجاد آج سے تقریباً سوا دو سو سال قبل 1799ء میں ہوئی، ویکسین لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا استعمال سب سے پہلے برطانیہ کے ڈاکٹر ایڈورڈ جینر (Dr. Edward Jenner) نے 1799ء میں کیا، ڈاکٹر ایڈورڈ جینر ایک مرتبہ کسی دورے پر تھا تو اس نے گائے سے دُودھ دوہنے والی خواتین کو دیکھا جن کے ہاتھوں اور بازوؤں پر آبلے پڑے ہوئے تھے؛ لیکن اس کے باوجود صحت مند تھی؛ کیوں کہ ان خواتین میں Cowpox وائرس — گائے سے انسانوں میں منتقل ہوتا ہے، جسے ''جدری البقر'' کہا جاتا ہے — موجود تھا، ڈاکٹر ایڈورڈ نے ان خواتین کو دیکھتے ہوئے اپنا ایک تجربہ کیا، اس سے پہلے انھوں نے 1770ء کی دہائی میں برسٹال (Bristol) کے ایک دُودھ دوہنے والے کے الفاظ سن رکھے تھے، جس نے کہا تھا کہ: ''مجھے Cowpox ہو چکا ہے اور اب مجھے چکن پاکس نہیں ہوگا، میرا چہرہ کبھی چیچک زدہ نہیں ہوگا'' جس سے معلوم ہوا کہ جسے Cowpox ہوتا ہے، اسے چیچک کی بیماری نہیں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر ایڈورڈ نے Cowpox سے متاثر شخص کے ہاتھوں میں لگے آبلوں سے مواد (Pus) حاصل کیا اور اسے ایک آٹھ سالہ بچے کے بازو میں کٹ لگا کر داخل کردیا، چھ ہفتوں بعد ڈاکٹر ایڈورڈ نے اس بچے کو Smallpox وائرس سے Expose کیا؛ لیکن وہ بچہ انفیکشن سے محفوظ رہا، ایڈورڈ کے اس تجربے نے 1799ء میں ایک تاریخ رقم کی، یہ دنیا کی سب سے پہلی ویکسین تھی، جسے Smallpox وائرس کے انفیکشن سے محفوظ کرنے کے لئے دنیا بھر میں استعمال کیا گیا، یہ زمانہ اس علاقہ میں عام طور پر ''چیچک'' جیسے خطرناک مرض کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، بہت سے چیچک کے ایسے مریض تھے جن کا کوئی یقینی علاج نہیں ہوا کرتا اور ان میں ایک بڑی تعداد اس مرض کی وجہ سے موت کا شکار ہوجاتی تھی۔

ایڈورڈ جینیر کی یہ تحقیق اور ریسرچ ایک طرف بالکل انوکھی اور نئی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قدر خطرناک

بھی تھی، اس بناء پر اس سائنٹسٹ کو مذہبی، سائنسی، سیاسی اور سماجی سطح پر بہت ہی مشکلات اور تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا، بہت سے عیسائی مذہبی رہنماؤں نے اس ٹیکہ کاری کو ''عیسائیت'' کے خلاف کہہ کر اس کی مخالفت کی، بہت سے لوگوں نے ٹیکہ کاری کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ انھیں لگتا تھا کہ اس سے ان کی آزادی کی خلاف ورزی ہوئی ہے، یہ ایک ایسا تناؤ تھا جو اس وقت مزید بدتر ہو گیا، جب حکومت نے لازمی ٹیکہ پالیسیاں تیار کیں، 1853 کے ٹیکہ کاری قانون نے 3 مہینے تک کے بچوں کے لئے ٹیکہ کاری کو لازمی قرار دیا اور 1867 کے قانون نے اس عمر کو بڑھا کر 14 سال تک کر دیا اور ٹیکہ کاری سے انکار پر جرمانہ شامل کیا، جس کے بعد وہاں کے شہریوں کی طرف سے ان قوانین کی مخالفت کی گئی جو اپنے اور اپنے بچوں کے اجسام کے کنٹرول کے حق کا مطالبہ کر رہے تھے، لازمی قوانین کے ردعمل میں ٹیکہ کاری مخالف انجمن وجود میں آئی اور متعدد اینٹی ویکسی نیشن (Anti Vacci Nation) جرائد کا ظہور ہوا۔

لیسیسٹر (Leicester) (شہر انگلینڈ) ٹیکہ مخالف سرگرمی کا ایک خاص مقام اور بہت سی ٹیکہ مخالف ریلیوں کی آماجگاہ رہ چکا ہے، یہاں کچھ لوگوں نے اپنے بچوں کو ٹیکہ دلوانے کے مخالفت کرتے ہوئے اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کرنے اور گرفتاری دینے کا عزم مصمم کیا، ان کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہوئے، جس کی بناء پر ایک بڑی بھیڑ جمع ہو گئی، بڑے پیمانے پر ٹیکے کی مخالفت میں نعرے لگائے گئے، جس کی وجہ سے ان لوگوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور وہ پولیس سیل میں داخل ہو گئے، 1885 کا لیسیسٹر احتجاج مارچ اینٹی ویکسی نیشن (Anti Vacci Nation) کے مشہور احتجاجات میں سے ایک ہے، ایسے احتجاجات اور ٹیکہ کی عام مخالفت کی وجہ سے ٹیکہ کاری کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک کمیشن وجود میں آیا، 1896 میں کمیشن نے چیچک کے خلاف ٹیکہ کاری کا فیصلہ کیا؛ لیکن ٹیکہ کاری نہ کرانے پر عائد جرمانے کو ہٹانے کا مشورہ دیا، 1898 کے ٹیکہ کاری قانون نے جرمانے کو ہٹا دیا اور ایک اخلاقی عذر کی دفعہ شامل کی؛ تاکہ وہ والدین جن کو ٹیکہ کاری کی سلامتی یا تاثیر پر بھروسہ نہیں ہے وہ ایک استثناء سرٹیفکیٹ حاصل کر سکیں۔

اینٹی ویکسی نیشن (Anti Vacci Nation) پوزیشن اور ٹیکہ کاری تنازعات اُٹھارہویں صدی ہی تک ہی محدود نہیں ہے، 1970 کی نصف دہائی میں DTP (خناق، اور کالی کھانسی) سے متعلق ایک بین الاقوامی تنازعہ یورپ، ایشیاء اور آسٹریلیا میں پیدا ہوا، ہندوستان اور پاکستان میں، بہت سی تنظیموں نے DTP ویکسی نیشن (Vacci Nation) کے مہمات کی مخالفت کی ہے، انھوں نے اس ٹیکہ کو نقصاندہ، غیر ضروری اور صحت کو کھوکھلا کرنے کے لئے امریکہ کی ایک چال قرار دیا ہے، اسی طرح لندن (یوکے) میں بیمار بچوں کے گریٹ اور مونڈ اسٹریٹ اسپتال سے حاصل ہونے والی رپورٹ کے ردعمل میں مخالفت سامنے آئی، اس الزام کے ساتھ کہ DTP

کی ٹیکہ کاری کے بعد 36 بچے نیورو لوجیکل حالات سے دوچار ہو چکے ہیں ، ٹیلی ویژن کے دستاویزی فلموں اوراخباروں کی رپورٹوں نے اس تنازعہ کی طرف عوام کی توجہ مبذول کی ، ایک وکالتی گروپ ، اسوسی ایشن آف پیرینٹس آف ویکسن ڈیمیجڈ چلڈرین (APVDC)، نے بھی DTP کے ممکنہ نقصانات اورنتائج میں عام مفادکو تحریک دی،اس کے جواب میں JCVI نے نیشنل چائلڈ ہوڈ انسیپھالوپیتھی مطالعہ (NCES) جاری کیا،مطالعہ میں 2اور 36 مہینے کے درمیان ہر بچے کی پہچان کی گئی جو نیورولوجیکل بیماری کی وجہ سے یوکے میں داخل اسپتال تھے اوراس بات کا اندازہ لگایا گیا کہ آیا ٹیکہ کاری کی وجہ سے نقصان میں اضافہ ہوا یا کی NCES نتائج نے اشارہ کیا کہ جوکھم بہت ہی کم تھااوراس ڈیٹا سے ایک ملکی ٹیکہ کاری مہم کو تائید حاصل ہوئی APVDC کے ممبران معاوضہ کے لئے کورٹ میں بحث کرتے رہے؛لیکن DTP کی مامونیت کے نقصان سے جڑے ثبوت کے فقدان کی وجہ سے انھیں اس کیس میں شکست ہوئی۔

معلوم ہوا کہ ویکسی نیشن (Vacci Nation) کی مخالفت صرف علماء ومفتیان اورمسلمانوں کی طرف سے ہی نہیں ہوئی ؛ بلکہ عیسائی پادریوں اور دیگر مذہبی رہنماؤں کے علاوہ بہت سے ڈاکٹروں اورسائنسدانوں کے طرف سے بھی ہوتی رہی ہے اورخود ایلوپیتھی موڈرن میڈیسن کے ڈاکٹروں کی ایک تنظیم نے اس کی مخالفت کی؛لیکن اس کا تناسب موافقت کرنے والوں اور تائید کرنے والوں کے مقابلہ میں بہت کم تھا، نیز مخالفت کے دلائل پیش کرنے سے عام طور پر یہ لوگ عاجز رہے، نیز ایلوپیتھی کے علاوہ دیگر طریقۂ علاج مثلاً ہومیوپیتھی اور یونانی وغیرہ کے بنیادی اُصول وضوابط کے اساسی نظریات ہی مختلف ہیں،اسی لئے ہومیوپیتھی وغیرہ ڈاکٹرحضرات تو سختی سے مخالفت کرتے ہیں ؛لیکن باوجود تلاش بسیار وتحقیق اور دقیق ریسرچ کے ان مخالفتوں کی بنیادی وجہ اورکوئی مضبوط اور واضح دلیل دستیاب نہ ہوسکی،اب ہم اسلامی نقطۂ نظر سے اس ویکسی نیشن کے سلسلہ میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خاص شان غنی اور بے نیازی ہے،اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہرطرح کے احتیاج وضرورت سے بری ہیں ؛ لیکن اللہ کی مخلوقات سراپا حاجت مند وضرورت مند ہے،انسان جواشرف المخلوقات ہے،اس کی ضروریات کا دائرہ تو اوربھی وسیع ہے، بہت سے جانور جنگل میں بسیرا کرتے ہیں ؛لیکن انسان بنے بنائے عمارت کا محتاج ہے، جانور گھاس ، پھوس اور شکار وغیرہ سے پیٹ بھر لیتے ہیں ؛لیکن انسان پکا پکایا کھانا ہی کھا سکتا ہے، اسی طرح بیماری اورمختلف قسم کی تکلیفیں اللہ تعالیٰ کی ہزاروں مخلوقات میں پائی جاتی ہے؛لیکن علاج ومعالجہ اورطب وحکمت سے متعلق اہتمام وانضمام صرف انسانوں ہی کا خاصہ ہے،اسی لئے احادیث مبارکہ میں علاج ومعالجہ کی ترغیب وارد ہوئی ہے، فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے :

عن أسامة بن شريک ، قال : قالت الأعراب : يا رسول الله ، ألا نتداوی ؟ قال : نعم ، يا عباد الله تداووا ، فإن الله لم يضع داء إلا وضع له شفاء ۔ (۱)

حضرت اسامہ بن شریکؓ فرماتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہم علاج و معالجہ نہ کرائیں ؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : اے اللہ کے بندو ! تم ضرور علاج و معالجہ کرایا کرو ؛ اس لئے کہ اللہ رب العزت نے ہر مرض کی دواء تیار کر رکھی ہے ۔

اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ انسان ضعیف و کمزور ہے، مستقل تکلیف و بیماری کو برداشت نہیں کرسکتا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تخفیف اور راحت کے خاطر شفاء کا وجود بھی رکھا ہے، سورۂ نساء میں ایک مقام پر انسان کی کمزوری اور اللہ کی طرف سے تخفیف اور آسانی کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۔ (النساء:۲۸)

اللہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے، (تم سے بوجھ کو ہلکا کرے) اور انسان کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ واضح طور پر یہ بتلایا گیا کہ جب انسان بیمار ہوگا یا اس کا کوئی عضو بیماری سے متاثر ہوگا تو اللہ رب العالمین ہی اس کو شفاء دیں گے ؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلا نے معبودانِ باطل کی نفی کرتے ہوئے اللہ رب العالمین کے صفات و کمالات کا جو ذکر کیا ہے، قرآن نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ، وَالَّذِیْ هُوَ يُطْعِمُنِیْ وَيَسْقِيْن ، وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۔ (الشعراء:۷۸-۸۰)

وہ اللہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے اور جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے جسمانی صحت کی قدر کرنے اور مرض سے شفاء حاصل کرنے کی تگ و دو اور جدوجہد کرنے کی تعلیم دی ہے، جسم و جان کی حفاظت اور صحت و تندرسی کا خیال رکھنا شریعتِ اسلامیہ کی بنیادی تعلیم اور مومن کامل کی علامت ہے، فرمانِ نبی ﷺ ہے کہ :

(۱) سنن الترمذی، باب ماجاء فی الدواء والحث علیہ: ۲۰۳۸ ۔

عن أبي هريرة قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : المؤمن القوي ، خير وأحب إلى الله من المؤمن الضعيف ۔ (۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن قوی، ضعیف اور کمزور مؤمن سے افضل وبہتر ہے۔

نیز جس طرح عبادات ومعاملات سے متعلق حقوق ہیں، اسی طرح ہر انسان پر اس کے جسم وجان کا بھی حق ہے، جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے :

عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما ، قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم : فإن لجسدك عليك حقا ، وإن لعينك عليك حقا ۔ (۲)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے اور تمہارے اوپر تمہاری آنکھوں کا حق ہے۔

یہ انسانی جسم وبدن امانت ہے، انسان اپنے منشا ومزاج کے مطابق اس میں تغیر وتبدل کرنے کا حقدار نہیں ہے ; بلکہ اس جسم کی حفاظت ونگہداشت اس کی شرعی ذمہ داری ہے، فقہاء اسلام کے نزدیک علاج ومعالجہ اور دوا وغیرہ کے سلسلہ میں بحیثیت حکم شرعی ایک سے زیادہ آراء ہیں، بعض کے نزدیک علاج ومعالجہ مباح ہے، بعض اس کو مستحب کہتے ہیں اور بعض تو وجوب کے قائل ہیں ; البتہ بحیثیت مجموعی سب ہی کے نزدیک علاج ومعالجہ اور دوا وغیرہ توکل کے منافی نہیں، اسی لئے دنیا بھر میں موجود علماء ومفتیان کی ایک بڑی جماعت مختلف جدید طبی مسائل پر غور وخوض کرتے رہے ہیں، ہندوستانی علماء ومفتیان کا ایک مؤقر ادارہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' کلوننگ، ڈی این اے ٹیسٹ، جینیٹک سائنس، انقلاب ماہیت، پلاسٹک سرجری، برتھ کنٹرول، اعضاء کی پیوندکاری، ٹیسٹ ٹیوب، بے بی اور اس جیسے متفرق مسائل پر بحث کر چکی ہے، معلوم ہوا کہ علاج ومعالجہ کے جدید طریقوں کو شکوک وشبہات اور بے جا اندیشوں کی بناء بلا تحقیق رد کرنا صحیح نہیں ہے، انسانی جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس کا خیال رکھنا اور اس کو تکلیفوں سے بچانا اس کا حق ہے، جیسا کہ ماقبل میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی گذر چکا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، باب في الأمر بالقوة وترك العجز الخ: ۲۶۶۴۔

(۲) صحیح بخاری، باب حق الجسم في الصوم: ۱۹۷۵۔

علامہ شاطبی اور دیگر اکابر علماء کرام نے یہاں تک فرمایا کہ اُمت اِسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ شریعت پانچ ضرورتوں، دین، جان، نفس، نسل، عقل اور مال کے حفاظت کے خاطر وضع کی گئی ہے؛ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ان تمام اُمور کی حفاظت ورعایت کریں۔

ویکسی نیشن کے سلسلہ میں جو بات نسل کشی اور بانجھ بنانے کے سلسلہ میں مشہور ہے، اس کی کوئی حقیقت تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملی، بعض برطانوی ڈاکٹروں کی طرف سے ریسرچ پیش کی گئی تھی، جس کو بعد میں انھوں نے خود ہی رد کردیا، اسی طرح خنزیر کے مادے کے استعمال کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا، پھر استہلاک اور استحلال سے متعلق عالمی سطح پر سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، خود اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جلاٹین کے سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی ہے۔

> شریعت نے جن اشیاء کو حرام قرار دیا ہے اور اگر ان کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہوجائے تو ان کا سابق حکم باقی نہیں رہتا ہے، کسی شئے کی وہ خصوصی اور بنیادی صفت جس سے اس شئے کی شناخت ہوتی ہے، وہی اس شئے کی حقیقت و ماہیت ہیں، اکیڈمی کے سامنے فنی ماہرین کے ذریعہ جو تحقیق سامنے آئی ہے اس کے مطابق جلاٹین میں ان جانوروں کی کھالوں اور ہڈیوں کی حقیقت باقی نہیں رہتی ہے، جن کے کولاجن (Collagen) سے جلاٹین (Gelatine) بنایا جاتا ہے؛ بلکہ وہ ایک نئی حقیقت کے ساتھ نئی چیز ہوجاتی ہے؛ اس لئے اس کے استعمال کی گنجائش ہے۔(۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فی نفسہٖ ویکسین کے استعمال پر شرعی اعتبار سے حرمت یا کراہت کا حکم لگانا درست معلوم نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ حفظ ماتقدم کے اعتبار سے مباح اور جائز امر ہے، شریعت مطہرہ میں حفظ ماتقدم کے اعتبار سے طریقۂ علاج نہ صرف مشروع ہے؛ بلکہ دورِ نبوی ﷺ میں اس کے نظائر موجود ہیں، مثلاً:

- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیمار اونٹ کو صحت منداونٹ کے پاس نہ لایا جائے۔(۲)
- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجذوم سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔(۳)

---

(۱) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۲۴۴۔ (۲) صحیح بخاری، باب الاہامۃ: ۵۷۷۱۔
(۳) صحیح بخاری، باب الجذام: ۵۷۰۷۔

● حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو اس کو ڈبو دو، پھر نکال دو؛ کیوں کہ اس کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفاء۔(۱)

● حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منھ ڈال دے تو اس میں موجود پانی وغیرہ کو بہا دو اور برتن کو سات مرتبہ دھولو۔(۲)

پھر یہ حفظ ماتقدم حفظ جان کی مناسبت سے ہو تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

دورِ نبوی میں اولاً بیماریاں بھی بہت کم تھی اور پھر اس کے لئے علاج ومعالجہ کے چند معدود طریقے تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ چند طریقے آج بھی دیگر تمام طرقِ علاج پر مقدم اور سب سے بہتر علاج کی صورتیں ہیں، جس میں بنیادی طور پر :

● زیتون کا تیل : ''کلوا الزیت وادھنوا بہ فإنہ من شجرۃ مبارکۃ''۔(۳)

● کھجور : ''من تصبح کل یوم سبع تمرات عجوۃ ، لم یضرہ فی ذلک الیوم ولا سحر''۔(۴)

● کلونجی : ''إن ھذہ الحبۃ السوداء شفاء من کل داء ، إلا من السام قلت : وما السام ؟ قال : الموت''۔(۵)

● تلبینہ : ''التلبینۃ مجمۃ لفؤاد المریض ، تذھب ببعض الحزن''۔

● شہد : ''علیکم بالشفاءین : العسل ، والقرآن''۔(۶)

● حجامہ : ''إن أمثل ماتداویتم بہ الحجامۃ ، والقسط البحری''۔(۷)

---

(۱) صحیح بخاری، باب اذا وقع الذباب فی شراب الخ: ۳۳۲۰۔
(۲) صحیح مسلم، باب کراھۃ غمس المتوضئ وغیرہ الخ: ۲۷۹۔
(۳) سنن الترمذی، عن عمر بن الخطاب، باب ماجاء فی اکل الزیت: ۱۸۵۔
(۴) صحیح بخاری، عن سعد، باب العجوۃ: ۵۴۴۵۔
(۵) صحیح بخاری، عن عائشۃ، باب الحبۃ السوداء: ۵۶۸۷۔
(۶) ابن ماجہ، عن عبداللہ، باب العسل: ۳۴۵۲۔
(۷) صحیح بخاری، باب الحجامۃ من الداء: ۵۶۹۶۔

بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تمام چیزیں ایک طرح سے حفظ ما تقدم ہی کے اُصول پر قائم طریقۂ علاج ہے، آخرالذکر حجامہ کے سلسلہ میں ایک اور روایت جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اس میں فرمانِ نبوی ﷺ ہے :

من احتجم لسبع عشرة ، وتسع عشرة ، و إحدى و عشرين ، كان شفاء من كل داء ۔ (۱)

حجامہ بھی ایک طریقۂ علاج ہے اور مذکورہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیماری کے بعد ہی نہیں لیا جاتا تھا؛ بلکہ صحت یاب آدمی بھی لے سکتا ہے؛ تاکہ بیماری سے بچا جائے، حجامہ کے ایک معالج ڈاکٹر امجد احسن علی نے حجامہ سے متعلق رسالہ میں حجامہ عام فوائد کے موضوع کے تحت یہ لکھا ہے کہ ''صحت یاب لوگ بھی کرا سکتے ہیں؛ کیوں کہ یہ سنت ہے اور اس میں بیماریوں سے روک ہے''۔

معلوم ہوا کہ یہ مذکورہ طرقِ علاج حفظ ما تقدم ہی کی مناسبت سے ہے اور ویکسی نیشن میں بھی جسم میں موجود مدافعتی نظام کو متحرک اور فعال کر کے بیماری سے مقابلہ کرنے کی طاقت وقوت پیدا کی جاتی ہے؛ البتہ جو خود ہی اس سے بچنا چاہے تو اسے مجبور بھی نہیں کرنا چاہئے اور جو والدین اپنے بچوں کو ویکسین لگائیں یا لگانے کی اجازت دیں، ان پر شرعی اعتبار سے روک لگانا یا ان کو منع کرنا صحیح نہیں ہے، خصوصاً مذکورہ علمی تحقیقات کے علاوہ تجربات اور مشاہدات بالکل واضح اور عیاں بیاں ہیں کہ گذشتہ سالوں میں بکثرت چیچک اور پولیو کے مریض نظر آتے ہیں، ان میں بہت سے موت کے شکار ہو جاتے تو بہت سے دائمی مریض اور مفلوج ومعذور ہو جایا کرتے تھے، ہم آپ کا کتنے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہوگا یا آمنا سامنا ہوا ہوگا جو پولیو کے مریض کے شکار رہے یا جن کے چہروں پر چیچک کے نشانات نظر آیا کرتے تھے؛ بلکہ بہت سے چیچک زدہ اشخاص بینائی سے محروم نظر آیا کرتے تھے، پھر اس ویکسی نیشن (Vacci Nation) کی تحریک کے بعد ان امراض میں یقیناً کمی ہونے لگی، جس کی بناء پر پولیو اور چیچک کے مریض آج کل شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، اسی لئے ویکسین کے استعمال پر شرعی نقطۂ نظر سے کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔

• • •

(۱) سنن ابی داؤد، عن ابی ہریرۃ، باب متی تستحب الحجامۃ: ۳۸۶۱۔

نکاح سے پہلے اور اس کے بعد

مفتی شاہد علی قاسمی ☆

''انسان کی زندگی میں جو سب سے اہم مسئلہ پیش آتا ہے وہ نکاح ہے، اس سے نہ صرف نسل انسانی کا تسلسل قائم ہے؛ بلکہ اسی کے ذریعہ انسانی خاندان وجود میں آتا ہے، انسان کو پاکیزہ زندگی میسر آتی ہے اور سماج اخلاقی بگاڑ سے محفوظ رہتا ہے؛ اسی لئے بعض دیگر مذاہب کے برعکس شریعت اسلامی نے نکاح کی ترغیب دی ہے اور تجرد کی زندگی کو ناپسند کیا ہے، نکاح چوں کہ ایک اہم ضرورت ہے؛ اس لئے شریعت میں نکاح کو بہت ہی سادہ اور آسان بنایا گیا ہے اور نہایت عدل واعتدال کے ساتھ شوہر وبیوی کے حقوق متعین کئے گئے ہیں؛ لیکن بدقسمتی سے برادران وطن سے متاثر ہوکر ہندوستان میں مسلمانوں نے نکاح کو ایک پُرتکلف اور بوجھل امر بنا دیا ہے، جس کے خراب نتائج ہمارے سامنے ہیں؛ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ نکاح کے موقع پر طرفین کو نکاح اور اس کے بعد کی آنے والی زندگی میں ضروری احکام ومسائل سے واقف کرایا جائے، وہ ایک دوسرے کے حقوق سے بھی آشنا ہوں اور اگر خدا نخواستہ کسی وجہ سے اس رشتہ کو ختم کرنا پڑے تو علاحدگی کی بہتر صورت کیا ہوگی؟ اس سلسلہ میں یہ رسالہ مرتب کیا گیا ہے، جو آپ کے سامنے ہے، اس میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ نکاح کو ختم کرنا پڑے تو اس کا شرعی طریقہ اور اس کے بعد فریقین پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں آسان اور عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے، بہ ظاہر یہ چند صفحات پر مشتمل ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک تفصیلی کتاب کے مضامین کو سمو دیا گیا ہے، قارئین اس سے استفادہ بھی کر سکتے ہیں اور طبع کر کے دوسروں تک بھی پہنچا سکتے ہیں''۔ (رحمانی)

☆ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

نکاح کی اہمیت اور اس کے احکام

- نکاح انبیاء کی سنت ہے۔(سنن الترمذی، حدیث نمبر:۱۰۸۰)
- عام حالات میں تجرد(بغیر نکاح) کی زندگی ناپسندیدہ ہے۔(بدائع الصنائع: ۲/ ۴۸۴)
- عبادت میں یکسوئی کی خاطر نکاح نہ کرنے کے مقابلہ نکاح کر لینا افضل ہے،خواہ وہ اس کی وجہ سے نفلی عبادات کے لئے زیادہ یکسوئی حاصل نہ ہو سکے۔(ردالمحتار: ۴/ ۵۷، کتاب النکاح)
- اگر مرد مہر اور نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو اور نکاح نہ کرنے کی صورت میں زنا میں پڑ جانے کا یقین ہو تو نکاح کرنا فرض ہے۔(ردالمحتار: ۴/ ۵۵، دارالکتاب)
- اگر مہر اور نفقہ پر قادر ہو اور نکاح کرنے کی صورت میں زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو نکاح کرنا واجب ہے۔(ردالمحتار: ۴/ ۵۵، دارالکتاب)
- اگر مہر اور نفقہ پر قادر ہو، اور نکاح کرنے کی صورت میں زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو تو نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے۔(ردالمحتار: ۴/ ۵۵، دارالکتاب)
- اگر نکاح کرنے کی صورت میں بیوی پر ظلم وزیادتی کے ارتکاب کا اندیشہ ہو تو نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے۔(ردالمحتار: ۴/ ۴۷، دارالکتاب)
- اگر بیوی پر ظلم وزیادتی کے ارتکاب کا یقین ہو تو نکاح کرنا حرام ہے۔(ردالمحتار: ۴/ ۴۷، دارالکتاب)

مقاصد نکاح

- نکاح سے عفت وعصمت اور قلب ونگاہ کی حفاظت ہوتی ہے اور زندگی پاکیزہ گذرتی ہے اور پاکیزہ زندگی انتہائی قیمتی چیز ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فإنه أغض للبصر وأحصن للفرج''(صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۹۰۵، ۵۰۶۶)''نکاح نگاہ کو پست رکھنے اور عفت و پاکدامنی کو باقی رکھنے کا باعث ہے''۔
- نکاح سے دل ودماغ کو سکون میسر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا''۔(سورۂ روم:۲۱)
- اور دل ودماغ کے سکون سے پورا جسم راحت محسوس کرتا ہے، جو بہت بڑی نعمت ہے۔
- نکاح سے نسل انسانی کی افزائش (زیادتی) اور اس میں تسلسل باقی رہتا ہے اور اس تسلسل سے دنیا کے نظام میں تسلسل ہے۔

● رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تزوجوا الودود والولود'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۵۰، سنن النسائی، حدیث نمبر: ۳۲۲۸) یعنی: ''زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ جننے والی عورت سے نکاح کرو''۔

خطبۂ نکاح

خطبۂ نکاح میں عام طور پر تین آیات پڑھی جاتی ہیں :

۱- يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۔ (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتوں کے بارے میں بھی اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تم لوگوں پر نگراں ہے۔

اس آیت میں وحدتِ انسانیت کا اعلان ہے، یعنی تمام انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں؛ اس لئے تمام انسانوں کو ایک کنبہ کے افراد کی طرح رہنا چاہئے، نیز اس آیت میں تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے اور رشتہ داروں کا خیال رکھنے کا حکم ہے۔

۲- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (آل عمران:۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہو۔

اس آیت میں بھی تقویٰ کی زندگی گزارنے اور تاحیات ایمان پر قائم رہنے کا حکم ہے۔

۳- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ، يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۔ (الاحزاب:۷۰-۷۱)

اے مسلمانو! اللہ سے ڈرتے رہو اور درست بات کہا کرو، اللہ تمہارے لئے تمہارے اعمال کو درست کردیں گے اور تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا، وہ بہت کامیاب ہوگا۔

اس آیت میں تقویٰ اختیار کرنے، سیدھی اور سچی بات کہنے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرنے کی تاکید ہے؛ تاکہ دنیا وآخرت کی کامیابی نصیب ہو۔

جہیز، ولیمہ اور رسم ورواج

● لڑکی یا اس کے والدین یا اس کے اقارب سے مطالبہ کرکے نقد یا سامان لینا رشوت ہے، جو حرام ہے، اس کی واپسی ضروری ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان علی ہامش الہندیہ: ۱/۳۹۱)

● اگر نقدی یا سامان کا مطالبہ نہ ہو؛ لیکن عرف ورواج (عام طور پر) کے اعتبار سے اس کو شرط نکاح کا درجہ حاصل ہو تو رقم یا سامان لینا اس صورت میں بھی رشوت ہے، جو جائز نہیں۔ (حوالۂ سابق)

● اگر جہیز کا مطالبہ نہ ہو اور لڑکی کے والدین اور رشتہ دار اپنی رضا ورغبت سے جہیز دیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (الاحکام الشرعیہ، دفعہ: ۱۱۲)

● نکاح میں سادگی اور کم اخراجات رکھنا پسندیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کم اخراجات والے نکاح کو زیادہ بابرکت قرار دیا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: ۳۰۳۳)

● نکاح کے بعد جب رُخصتی ہوجائے اور شوہر وبیوی کی یکجائی ہوچکی ہو تو ولیمہ کرنا مسنون ہے، جو مرد کے ذمہ ہے۔

● نکاح مسجد میں کرنا مسنون ہے، اسی طرح نکاح کو مخفی رکھنے کے بجائے اتنی شہرت دینا کہ اہل تعلق جان جائیں مسنون ہے۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۱۰۸۹)

● مختلف علاقوں میں نکاح کے موقع پر مختلف رسوم مروج ہیں، ان سے بچنا ضروری ہے۔

● شادی میں فضول خرچی عام بات ہوچکی ہے، یہ کیفیت سماج کے لئے تباہی کی باعث ہے، حتی الامکان اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

شوہر کی ذمہ داریاں

عقد نکاح کے بعد شوہر پر کچھ مالی اور کچھ غیر مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

۱- **مہر**: مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم ہے، یعنی ۳۰/گرام ۶۱۸ ملی گرام چاندی، یا اس کی مالیت کی کوئی بھی چیز۔ (البحر الرائق: ۳/۱۴۲)

● مہر کی حیثیت دَین (قرض) کی ہے اس کی ادائیگی ضروری ہے، ہاں اگر بیوی بلا جبر واکراہ (زور زبردستی کے بغیر) خوش دلی سے مکمل یا بعض حصہ معاف کردے تو کوئی حرج نہیں۔

● اگر مہر معجّل ہوتو بہ وقت نکاح یا بیوی کے مطالبہ پر فوراًادا کرنا ضروری ہے۔

● اگر مہر مؤجل ہوتو بہ وقت نکاح یا بیوی کے مطالبہ پر فوراًادا کرنا ضروری ہے۔

● اگر مہر مؤجل ہو یعنی اس کی ادائیگی کا کوئی وقت مقرر کیا گیا ہوتو مقرر وقت پر اسے ادا کردینا ضروری ہے۔

● اگر معجّل یا مؤجل کی صراحت نہ کی گئی ہوتو عرف کا اعتبار ہوگا اور آج کے عرف کے اعتبار سے طلاق یا موت کے وقت مہر کی ادائیگی لازم ہوگی۔(البحر الرائق: ۳/۱۷۷)

۲- **نفقہ** : بیوی کی رُخصتی کے بعد شوہر پر اس کا نفقہ واجب ہوجاتا ہے، نفقہ سے مراد کھانا، لباس وپوشاک اور رہائش کا انتظام ہے، شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق یہ سب چیزیں فراہم کرے۔

● زندگی کی دوسری ضروریات جیسے علاج ومعالجہ بھی فی زمانہ شوہر کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔(کتاب الفتاویٰ: ۵/۱۴۸)

۳- مرد کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ بیوی کی جنسی خواہش کو پورا کرے، اس سلسلہ میں اعتدال ومیانہ روی کا پہلو ملحوظ رکھنا چاہئے۔(ردالمحتار: ۴/۳۷۹، باب القسم)

بیوی کی ذمہ داری

۱- بیوی پر فرض ہے کہ شوہر کی اطاعت کرے، ہاں، اگر شوہر شریعت کے خلاف کسی بات کا حکم دے تو اسے ماننا درست نہیں ہے۔

۲- بیوی پر فرض ہے کہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، بچوں کی دیکھ ریکھ کرے، ان کی دینی واخلاقی تربیت کرے۔(مشکوٰۃ، کتاب الامارۃ: ۲/۳۲۰)

۳- شوہر کے گھر کے سامان ومال کی نگرانی بھی بیوی کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔

اخلاقی ذمہ داریاں

۱- گھر میں خادمہ کا نظم نہ ہوتو گھریلو کام کاج کرنا، جیسے پکوان، صفائی ستھرائی وغیرہ بیوی کی اخلاقی ذمہ داریوں میں ہے۔

۲- اگر نومولود شیرخوار کے لئے باپ دُودھ پلانے اور دیکھ ریکھ کا دوسرا نظم کرسکتا ہو، پھر بھی نومولود کی ماں کا اخلاقی فریضہ ہے کہ دُودھ پلائے اور دیکھ ریکھ کرے۔

۳- شوہر و بیوی کا ایک دوسرے پر حق ہے کہ باہم حسن سلوک کا برتاؤ کریں اور بلا وجہ شرعی ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچائیں۔

۴- گھر میں ساس اور سسر کا خیال رکھنا بیوی کے اخلاقی فرائض میں داخل ہے۔

۵- اگر بیوی والدین سے ملاقات کے لئے میکہ جانا چاہے تو شوہر کو چاہئے کہ وقفہ وقفہ سے بیوی کو میکہ جانے کی اجازت دے۔

٦- اگر شوہر کے گھر بیوی کے رشتہ دار آئیں تو شوہر کو چاہئے کہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے، اسی طرح شوہر کے رشتہ دار آئیں تو بیوی ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرے۔

طلاق، خلع اور فسخ نکاح

- طلاق ایک ناپسندیدہ فعل ہے، معقول وجہ کے بغیر طلاق دینا گناہ ہے، اگر بلا وجہ بیوی کو ایذاء پہنچانے کی غرض سے طلاق دی جائے تو یہ حرام ہے۔
- بعض مرتبہ شوہر و بیوی کے درمیان شدید نفرت پیدا ہوجاتی ہے یا شوہر بیوی کا حق ادانہیں کر پاتا ہے اور بیوی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، یہ اور ان جیسے معقول وجوہ سے طلاق دینا مباح ہے؛ تاکہ زوجین علاحدگی کے ذریعہ گھٹن کے ماحول اور تکلیف دہ حالات سے باہر نکل سکیں۔

طلاق سے پہلے کے مراحل

(الف) زوجین کے درمیان اختلاف اور منافرت (ایک دوسرے سے نفرت) کی صورت میں اولاً افہام وتفہیم (سمجھانا) اور پند ونصیحت کا سہارا لینا چاہئے۔

(ب) اس سے اصلاح نہ ہو تو خواب گاہ علاحدہ کرلے۔

(ج) وہ بھی کارگر نہ ہو تو کسی قدر سرزنش (سختی) کی اجازت ہے، ہلکی مار کی اجازت ہے، تکلیف دہ مار نہ ہو۔

(د) یہ تینوں تدبیریں کارگر نہ ہوں تو شوہر کی طرف سے ایک اور بیوی کی طرف سے ایک باشعور تجربہ کار بزرگ کو حکم (فیصلہ کرنے والا) بنایا جائے اور دونوں حکم اختلافات کو دُور کرنے اور فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کریں۔ (النساء: ۳۴-۳۵)

طریقۂ طلاق

اگر اصلاح کی تمام کوشش ناکام ہوجائیں تو طلاق دینے کی اجازت ہے :

● طلاق دینے کے تین طریقے ہیں :

۱- جب بیوی پاکی کی حالت میں ہوتو ایک طلاق دی جائے اور مزید طلاق نہ دی جائے ، یہاں تک کہ عدت ختم ہوجائے۔

حکم : جب تک عدت ختم نہ ہو یہ ایک ''طلاق رجعی'' کہلاتی ہے اور جب عدت ختم ہوجائے تو یہ ''ایک طلاق رجعی''، ایک ''طلاق بائن'' میں تبدیل ہوجاتی ہے، اس طلاق میں عدت کے درمیان غور وفکر کا پورا موقع رہتا ہے، اگر زوجین کو ندامت ہو اور رشتہ کو بحال کرنا چاہتے ہوں تو شوہر زبانی بھی لوٹا سکتا ہے، جیسے وہ کہے: ''میں نے اپنی بیوی فلانہ بنت فلاں کو دوبارہ نکاح میں لوٹالیا''، عدت ختم ہونے کے بعد زبانی لوٹانے کا حق باقی نہیں رہتا ہے؛ البتہ تجدید نکاح کی گنجائش رہتی ہے، جس میں بیوی پر زبردستی نہیں کی جاسکتی ، اس کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

اگر شوہر نے ایک طلاق کے بجائے دوطلاق بیک دفعہ یا دوسری طلاق وقفہ کے بعد دی تو یہ ''دوطلاق رجعی'' کہلاتی ہے، اس کا حکم بھی وہی ہے جو ایک طلاق کا بیان کیا گیا، یعنی عدت ختم ہونے سے پہلے زبانی اور عدت ختم ہونے کے بعد تجدید نکاح سے بیوی کو لوٹانے کی گنجائش رہتی ہے ؛ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں شوہر کو آئندہ دوطلاق کا حق رہے گا اور دوسری صورت میں آئندہ ایک ہی طلاق کا حق رہے گا، دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی صورت طلاق دینے کی سب سے بہتر شکل ہے، نہ کہ دوسری صورت۔

۲- پاکی کی حالت میں ایک طلاق دی جائے ، پھر دوسری پاکی کے زمانہ میں دوسری طلاق دی جائے ، اسی طرح تیسری پاکی کی حالت میں تیسری طلاق دی جائے۔(مستفاداز: ردالمحتار:۵/۷۱-۳۱-۳۲۲،دارالکتاب)

تیسری طلاق پڑنے کے بعد بیوی پر طلاق مغلظہ واقع ہوجاتی ہے۔

حکم : اس کا حکم یہ ہے کہ بیوی شوہر پر حرام ہوجاتی ہے، نہ زبانی اور نہ تجدید نکاح سے لوٹانے کی گنجائش رہتی ہے، ہاں اگر عدت ختم ہونے کے بعد مطلقہ خاتون نے کسی اور مرد سے نکاح کیا اور اس سے جنسی تعلق بھی قائم ہوا، پھر شوہر نے اتفاقاً طلاق دے دی یا اس کی موت ہوگئی، پھر عدت طلاق یا عدت وفات گذر گئی تو اب یہ خاتون آپسی رضامندی سے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے، اس کو ''حلالہ شرعیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔(البقرۃ:۲۳۰ ،البحر الرائق، کتاب الطلاق، فصل فیما تحل بہ المطلقۃ)

● اگر منصوبہ بند اور سمجھوتہ کے ساتھ حلالہ کیا گیا تو یہ گناہ اور موجب لعنت ہے، تاہم اگر اس طرح حلالہ کرلیا گیا تو گناہ کے باوجود مطلقہ خاتون پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجاتی ہے۔

۳- طلاق دینے کا تیسرا طریقہ طلاق کی وہ تمام شکلیں ہیں جو پہلی دوصورتوں کے علاوہ ہوں، جیسے بیک دفعہ تین طلاق دی جائے، یا وقفہ وقفہ سے تین طلاق ایک پاکی کے زمانہ میں دی جائے یا ناپاکی یا حمل کی حالت میں طلاق دی جائے وغیرہ، یہ سب صورتیں ''طلاق بدعی'' کہلاتی ہیں۔

حکم : اس طلاق کا حک یہ ہے کہ تین طلاق دیتے ہی، بیوی پر تینوں طلاقیں (طلاقِ مغلظہ) واقع ہوجاتی ہیں اور بیوی شوہر پر حرام ہوجاتی ہے، حلالۂ شرعیہ کے بغیر حلال نہیں ہوسکتی۔

طلاق کی یہ صورت شرعاً معصیت ہے، اس سے بچنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کے پاس اگر کبھی تین طلاق کا معاملہ سامنے آتا تو آپ ﷺ سخت ناراضگی کا اظہار فرماتے، تاہم کوئی نادانی میں تین طلاق دے ہی دے تو تینوں طلاقیں ہوجائیں گی۔

خلع

رشتۂ نکاح ختم کرنے کی خاطر بیوی کی طرف سے مال کی پیشکش ہو اور شوہر اسے قبول کرتے ہوئے طلاق دے دے تو یہ ''خلع'' کہلاتا ہے، شوہر ''خلع'' منظور کرتے ہوئے لفظ طلاق، یا لفظ خلع یا اس جیسے الفاظ بھی استعمال کرسکتا ہے۔(الدر المختار علی ہامش الرد: ۵/ ۸۳-۸۴)

اگر شوہر نے مال کے عوض طلاق دینے کی پیشکش کی اور عورت نے عوض دینا قبول کرلیا؛ چنانچہ شوہر نے مال کے عوض طلاق دے دی تو یہ بھی خلع ہے۔

● خلع کا معاملہ وجود میں آنے کے بعد بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے۔

● خلع میں مال کی جو مقدار طے ہوجائے درست ہے؛ لیکن مقدار مہر سے زیادہ مال متعین کرنا اور لینا بہر حال ناپسندیدہ ہے۔(فتاویٰ ہندیہ: ۱/ ۴۸۸)

● خلع کے ذریعہ وہ حقوق ساقط ہوں گے اور وہ عوض واجب الاداء (دینا ضروری) ہوگا، جن کے اسقاط اور جن کی ادائیگی پر باہم اتفاق ہوگیا ہو۔(ہدایہ مع الفتح: ۳/ ۲۱۴-۲۱۶)

اگر زوجین کے درمیان شدید اختلاف ہو اور شوہر ظلم کرتا ہو، طلاق بھی نہ دیتا ہو تو بیوی خلع کا سہارا لے سکتی ہے، تاہم شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع کا معاملہ وجود میں نہیں آسکتا ہے۔

فسخ وتفریق

● اگر شوہر ظلم کرتا ہو، حقوق ادا نہ کرتا ہو، یا مفقود الخبر ہو، یا نفقہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور بیوی علاحدگی

چاہتی ہو اور شوہر طلاق وخلع پر آمادہ نہ ہو تو عورت دار القضاء کے ذریعہ نکاح فسخ کرا سکتی ہے، اس طرح مظلومہ بیوی ظلم سے نجات پاسکتی ہے۔

- زوجین کے درمیان تفریق کے لئے قاضی شرع کا فیصلہ درج ذیل صورتوں میں ضروری ہے :

۱- شوہر کا حقوق زوجیت ادا نہ کرنا۔
۲- شوہر کا وطی پر قادر نہ ہونا۔
۳- غیر کفوء میں نکاح۔
۴- مہر کے اندر غیر معمولی کمی۔
۵- شہور کا جذام، برص یا اس جیسے کسی موذی مرض میں مبتلا ہونا۔
۶- شوہر کا مجنون ہونا۔
۷- شوہر کا مفقود الخبر ہونا۔
۸- شوہر کا غائب غیر مفقود ہونا۔
۹- شوہر کا استطاعت کے باوجود نفقہ نہ دینا۔
۱۰- شوہر کا نفقہ کی ادائیگی سے عاجز ہونا۔
۱۱- شوہر کا بیوی کو سخت مار پیٹ کرنا۔
۱۲- زوجین میں شدید اختلاف اور تنفر کا پایا جانا۔
۱۳- تفریق بہ سبب حرمت مصاہرت۔
۱۴- تفریق بہ سبب فساد نکاح۔
۱۵- مرد کا اپنی حالت کے بارے میں عورت کو دھوکہ میں ڈال کر نکاح کرنا۔
۱۶- خیار بلوغ۔

عدت کے مسائل

واقعۂ طلاق یا خلع کے بعد فوراً عدت شروع ہوجاتی ہے، خواہ مطلقہ کو اس کا علم نہ ہو۔ (البحر الرائق: ۴/۴۴۱، باب العدۃ)

- اگر عورت کو حیض آتا ہو تو واقعۂ طلاق یا خلع کے بعد تین حیض مکمل ہوجائے تو عدت ختم ہوجاتی ہے، اگر کم عمری یا زیادہ عمر کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو تو عدت کی مدت قمری تین مہینے ہیں۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۱/۵۲۶، باب العدۃ)
- اگر خاتون حاملہ ہو تو وضع حمل سے عدت مکمل ہوگی۔

● نکاح صحیح کے بعد وطی یا خلوت سے پہلے علاحدگی ہوگئی تو عدت واجب نہیں ہے؛ لیکن اگر شوہر کا انتقال ہوجائے تو بہر حال عدت واجب ہے۔ (حوالۂ سابق)

● اگر شوہر کا انتقال ہوگیا تو بیوہ پر عدت وفات گزارنا ضروری ہے، جس کی مدت قمری چار ماہ دس دن ہے، خواہ اسے حیض آتا ہو یا نہیں، (البقرۃ: ۲۳۴) چار ماہ دس دن اس وقت جب کہ شوہر کی وفات مہینہ کے شروع میں ہو، اگر مہینہ کے شروع میں انتقال نہ ہو تو مکمل ایک سو تیس دن عدت کی مدت ہے۔ (ردالمحتار: ۵/ ۱۸۷، باب العدۃ)

● اگر شوہر کے انتقال کے وقت بیوی حاملہ تھی تو اس کی عدت بچہ کی پیدائش سے مکمل ہوگی۔ (الطلاق: ۴، ہدایہ: ۲/ ۴۲۳)

● وقوع طلاق کے بعد مطلقہ وہیں عدت گذارے گی، جہاں عورت کو شوہر کی طرف سے رہائش فراہم کی گئی تھی، بغیر معقول عذر کے اس مکان سے نکلنا جائز نہیں ہے، طلاق رجعی کے علاوہ علاحدگی کی تمام صورتوں میں مرد سے سخت پردہ اور احتیاط لازم ہے، اگر عورت کی عصمت وعزت کو خطرہ لاحق ہو تو قاضی مرد کو باہر رہنے کا حکم دے۔ (ردالمحتار: ۵/ ۱۲۳، فصل الحداد)

● عدت کی حالت میں تیل، سرمہ، مہندی، کنگھی، ریشم یا شوخ رنگ کا کپڑا یا اس طرح دوسری زینت کی چیزیں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ (الدرالمختار علی ہامش الرد: ۵/ ۲۱۷-۲۱۸، فصل فی الحداد)

● ● ●

امام محمد بن ادریس شافعی — حالات وافکار

مولانا ابراہیم بن علی خطیب ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد
المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين أما بعد۔

نسب

امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع بن السائب بن عبید بن یزید بن ہاشم بن المطلب بن عبد مناف المطلبی القرشی۔

امام صاحب کا نسب عبد مناف بن قصی پر جا کر حضور اکرم ﷺ کے ساتھ مل جاتا ہے، آپ کے اجداد میں شافع بن سائب جمہور علماء کے بقول صحابی ہے، غالباً اسی لئے عثمان بن شافع کی اولاد شافعی کہلائی، حضرت کے نسب پر بعضوں نے جو کلام کرنے کی کوشش کی ہے، امام رازیؒ نے مناقب الامام الشافعی میں اس کی مدلل و پرزور تردید کی ہے، اس سلسلہ میں ''الانتقاء فی مناقب الائمۃ الثلاثۃ الفقہاء'' کی تحقیق میں شیخ محمد زاہد الکوثریؒ فرماتے ہیں :

والتعويل عليه من بعض الحنفية والمالكية تعصب بارد ولهم
أن يناقشوه في علمه لا في نسبه۔ (۱)

امام شافعی کے اجداد میں حضرت شافع سے یزید تک چاروں حضرات شرف صحابیت سے مشرف ہیں، اکثر حضرات نے امام صاحب کی والدہ کو قبیلہ اَزْد کی طرف منسوب کیا ہے، جسے حدیث میں ''ازد اللہ فی الارض'' قرار دیا گیا ہے۔

امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں وفات پا گئے، اس مدت میں حضرت نے عباسی دورِ خلافت کے ۶ر خلفاء ابوجعفر المنصور، محمد المہدی، موسی الہادی، ہارون رشید، محمد الامین بن ہارون رشید اور عبداللہ المامون بن ہارون رشید کا زمانہ پایا، مجموعی طور پر یہ دور داخلی اور خارجی اعتبار سے خلافت اسلامیہ کے شوکت وقوت کا دور تھا،

☆ شیخ الحدیث: جامعہ حسینیہ عربیہ شری وردھن، رائے گڑھ، مہاراشٹر۔

(۱) علامہ ابوہاشم ابراہیم بن منصور ہاشمی نے ''اتحاف الأمۃ بصحۃ قرشیۃ الامام الشافعی'' نامی رسالہ میں اس پر مدلل وسیر حاصل بحث کی ہے۔

نیز ان حضرات نے مختلف طریقوں سے علم اور علماء کی سرپرستی اور ہمت افزائی فرمائی ہے، علماء کی مالی اعانت میں پیش پیش رہے ہیں، عام مکتبات کے قیام کی طرف خصوصی توجہ دی، جن میں سرفہرست بغداد کا دارالحکمۃ تھا، ان کے دربار میں مختلف علمی مباحث اور علمی مناظر بھی ہوتے تھے۔

امام شافعی فلسطین کی ایک بستی غزہ میں پیدا ہوئے، دوسال کی عمر میں والدہ محترمہ انھیں مکہ مکرمہ لے آئی اور بچپن ہی سے علمی رغبت دلائی اور بقول امام شافعیؒ ۷/سال کی عمر میں قرآن کریم کو حفظ کرلیا اور ۹/سال میں موٴطا امام مالک حفظ کرلی۔(۱)

اس کے بعد مکہ مکرمہ کے قرب وجوار میں آباد قبیلہ ہذیل کے خاندانوں میں خالص عرب حضرات سے فصیح عربی لغت سیکھنے کے لئے آمدورفت جاری رہی، ان حضرات کی زبان لحن یا عجمیت کی آمیزش سے پاک تھی اس کی وجہ سے امام شافعیؒ کو خالص اور فصیح عربی زبان پر کامل دسترس حاصل ہوئی، جو کلام اللہ عزوجل اور کلام رسول اللہ ﷺ کے حقائق وتہہ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہوئی، بقول علماء عربی لغت میں مہارت اجتہاد کے اہم وسائل وشرائط میں سے ہے، امام ابن ہشام نحوی صاحب المغازی فرماتے ہیں کہ امام شافعی تو ایسی شخصیت ہیں ان سے لغت کو سیکھا جاتا ہے، ان کے مشہور شاگرد امام ربیع مرادی فرماتے ہیں کہ اگر آپ امام شافعیؒ اور ان کے حسن بیان وفصاحت کو دیکھتے تو تعجب میں پڑ جاتے، حضرت جس انداز کی عربی گفتگو کرتے تھے، اگر اس کے مطابق یہ کتابیں تصنیف فرماتے تو ان کا پڑھنا مشکل ہوجاتا۔

امام شافعیؒ نے اشعارِ عرب بھی بڑی تعداد میں حفظ کرلئے، امام بیہقی اپنی سند سے امام اصمعی سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے ہذلیین کے اشعار کی تصحیح مکہ مکرمہ میں قریش کے محمد بن ادریس الشافعی نامی ایک نوجوان کے پاس کی، نیز امام شافعی سے نقل فرمایا کہ اس سے یعنی عربی زبان میں مہارت کے لئے اس مجاہدہ سے میرا مقصود محض فقہ پر استعانت تھی۔(۲)

شیوخ مکہ

(۱) سفیان بن عیینہ : یہ اپنے وقت کے محدث حرم مکی ہیں، اکابر تبع تابعین میں شمار ہوتا ہے، ان کی امامت فی الحدیث پر محدثین کا اتفاق ہے، ابتدا سے ہی تحصیل حدیث کے لئے امام شافعی موصوف سے متعلق ہوگئے اور ان کی محبت وتلمذ نے بچپن ہی سے حدیث کی محبت دل میں بٹھادی، جسے شیخ الحرم المدنی امام مالکؒ کی صحبت نے مزید جلا ومضبوطی بخشی جس کی وجہ سے مدرسہ اہل حدیث کے ایک اہم امام اور مجتہد شمار ہوئے، بقول بعض محققین کے صرف اپنی ''الرسالہ'' میں امام شافعیؒ نے امام سفیان سے ۴۳/احادیث نقل فرمائی ہیں۔(۳)

(۱) توالی التأسیس للحافظ: ۵۴۔ (۲) مناقب الشافعی للبیہقی۔ (۳) المدخل الی مذہب الامام الشافعی للدکتور اکرم القواسمی: ۵۰۔

(۲) مسلم بن خالد الزنجی : ان سے امام شافعی نے علم فقہ حاصل کیا، یہ اپنے وقت کے شیخ الحرم اور مفتی مکہ تھے، حضرت کا اشتغال فقہ سے حدیث کی بہ نسبت زیادہ تھا، امام شافعیؒ جب ۱۵/سال کے ہوئے تو امام مسلم نے ان سے کہا کہ ابوعبداللہ تم فتویٰ دیا کرو، اب وقت آچکا ہے کہ تم فتویٰ دو، امام شافعیؒ نے مکہ مکرمہ کے دیگر محدثین وفقہاء سے بھی کسب فیض فرمایا، امام بیہقی نے صرف مکہ مکرمہ میں امام شافعیؒ کے ۱۹/شیوخ کا تذکرہ کیا ہے۔(۱)

مکہ مکرمہ کے علماء کرام سے علمی دولت سمیٹنے کے بعد اپنی مزید علمی تشنگی کی سیرابی کے لئے امام صاحب نے مدینہ منورہ کی طرف رخت سفر باندھا اور پہلی مرتبہ ۱۳/سال کی عمر میں امام دارالہجرہ امام مالکؒ کی خدمت میں حاضری دی۔

کتب مناقب الشافعی میں مکہ مکرمہ سے امام شافعی کی مدینہ منورہ میں امام مالکؒ کی خدمت میں حاضری کی روداد سفر تفصیل سے موجود ہے، امام مالک صاحب فراست شخص تھے، پہلی ہی ملاقات میں امام شافعی سے فرمایا: اے محمد! تقویٰ الٰہی اختیار کرو، معاصی سے مجتنب رہو؛ کیوں کہ مستقبل میں تمہاری ایک شان ہوگی، پھر امام شافعی نے حضرت کی خدمت میں مؤطا پڑھنا شروع کی، امام شافعی کے حسن قرأت واعراب سے وہ بہت خوش ہوئے۔

امام شافعیؒ نے ان کی خدمت میں رہ کر ان کے فقہی دروس سے بھی بھرپور استفادہ کیا اور اس طرح مکہ مکرمہ میں امام مسلم سے شروع کی گئی فقہی استعداد کو مزید تکمیل تک پہنچایا، نیز حدیث کے مختلف مباحث میں سیر حاصل استفادہ کرکے اس کی بھی تکمیل فرمائی، جس کی ابتداء مکہ مکرمہ میں امام ابن عیینہ سے ہوئی تھی، ابن عیینہ خود اپنے مقابلے میں امام مالک کے تفوق کے قائل تھے، اب امام مالک کی خدمت میں طویل مدت تک تحصیل علم میں مشغولیت کے بعد وہی امام شافعی کے حدیث وفقہ میں شیخ اول بن گئے؛ لہٰذا ابن عبدالبرؒ نے ''الانتقاء'' میں امام شافعی کا یہ قول نقل فرمایا ہے، علماء میں امام مالک ستارہ ہیں اور مجھ پر امام مالک سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں، (۲) نیز نقل فرمایا: مالک میرے معلم ہیں اور انھیں سے میں نے علم حاصل کیا ہے۔

مدینہ میں ورود وقیام کے دوران بقول امام بیہقی مزید ۱۳/شیوخ سے امام شافعی نے حدیث وفقہ میں کسب فیض فرمایا۔

یمن روانگی

۱۷۹ھ میں امام مالک اور امام مسلم زنجی کی وفات کے بعد تقریباً ۲۹/سال کی عمر میں امام شافعی یمن روانہ ہوئے اور وہاں منصب قضاء پر فائز ہوئے، وہاں اپنی ذمہ داری کو انتہائی عدل وانصاف کے ساتھ نبھاتے رہے،

(۱) مناقب الشافعی للبیہقی: ۲/۳۱۱-۳۱۲۔ (۲) الانتقاء: ۵۵۔

مظلومین کو ان کا حق دلانے میں کوشاں رہے اور اہل بدعت سے بالکل کنارہ کش رہے، حضرت کا یہ رویہ باطل پرستوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا اور ان کے مفاد پر ضرب پڑنے لگی تو انھوں نے خلیفۂ وقت ہارون رشید تک امام شافعی کے خلاف ریشہ دوانی کرتے ہوئے یہ بے بنیاد الزام عائد کیا کہ وہ بعض علویین کے ساتھ مل کر خلافت عباسیہ کے خلاف خروج وبغاوت کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

بغداد میں ورود

۱۸۴ھ میں بغاوت کے الزام میں امام شافعیؒ کو گرفتار کرکے بغداد میں خلیفۂ وقت ہارون رشید کے دربار میں پیش کیا گیا؛ لیکن امام صاحب کے مدلل جواب اور امام محمد بن حسنؒ کی تائید سے خلیفہ کو اطمینان ہوا اور اس طرح امام شافعی کو اس مصیبت سے نجات ملی، اس کے بعد بغداد کی علمی فضاء کتب خانوں اور عظیم علماء وادباء کی موجودگی اس عاشق علم کو وہیں رہنے پر مجبور کیا۔

امام محمد بن حسن الشیبانی

اصحاب الرائ کے اکابر ائمہ بالعموم عراق میں اور بالخصوص بغداد وکوفہ میں قیام پذیر تھے، جن میں اس وقت نمایاں ترین شخصیت امام محمد کی تھی جو امام ابویوسف کی وفات کے بعد اب قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے اور اس مکتبہ فکر کے علم بردار تھے، موصوف سے امام شافعی کی ملاقات اس سے قبل حجازِ مقدس میں ہوچکی تھی، اب موقع ملا تو امام محمدؒ کے حلقۂ درس سے وابستہ ہوکر ان سے فقہ حنفی اور اس کے اُصول پر دسترس حاصل کی، حتیٰ کہ وہ خود فرماتے ہیں: ''میں نے محمد بن حسن سے ایک اونٹ کے بوجھ برابر علم حاصل کیا'' (۱)—اور قاضی صیمری ان سے ناقل ہیں: ''مجھ پر امام مالک کی استادی کا حق ہے، پھر اس کے بعد امام محمد بن حسن کا''۔ (۲)

بغداد میں قیام کے دوران امام شافعی نے دیگر کئی اکابر علماء سے بھی علم حاصل کیا، جن میں سرفہرست ائمہ وکیع بن جراح، عبدالوہاب بن عبدالمجید الثقفی اور اسماعیل بن ابراہیم البصری رحمہم اللہ ہیں۔

مکہ مکرمہ میں ورود

تقریباً ۵ رسال بغداد میں گزارنے کے بعد امام محمد کے انتقال کے بعد امام شافعی مکہ مکرمہ لوٹے، مکہ مکرمہ میں تشریف آوری کے بعد امام شافعی نے کعبۃ اللہ کے سایہ میں اپنا درسی حلقہ شروع کیا اور لوگوں کو فتویٰ دینے لگے، اس حلقہ اور مرحلہ میں انھوں نے اپنے مستقل فقہی مکتب فکر کی حیثیت سے فتویٰ دینا شروع کیا، اکابر علماء ائمہ نے اسی دوران امام شافعی سے استفادہ کیا، جن میں امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ کا نام سرفہرست ہے۔

---

(۱) آداب الشافعی لابن ابی حاتم۔ (۲) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ۔

حج کی مناسبت سے چوں کہ مکہ مکرمہ میں ہر خطہ کے علماء وعوام وغیرہ کی آمدورفت رہتی، جس کی وجہ سے امام شافعی کی علمی شخصیت کی دنیاءِ اسلام میں بڑی شہرت ہوئی۔

دوبارہ بغداد میں ورود

تقریباً ۶ر سال تک مکہ مکرمہ میں حدیث وفقہ کی تعلیم وتدریس کے بعد ۱۹۵ھ میں امام شافعی دارالخلافہ بغداد تشریف لے گئے، بغداد میں حضرت نے مسجد جامع کبیر میں اپنا علمی وتدریسی حلقہ شروع کیا، جو کہ پہلے سے بکثرت حلقوں سے معمور تھا، بقول ابراہیم الحربی: ''مسجد میں ۲۰ر حلقے قائم تھے؛ لیکن امام صاحب کے حلقہ کے بعد ایک ہی ہفتہ میں ان میں سے تین چار ہی باقی رہے''۔(۱)

امام شافعی کے عراقی تلامذہ

(۱) ابوثور الکلبیؒ۔ (۲) ابوعلی الکرابیسیؒ۔ (۳) الحسن الزعفرانیؒ۔

اپنے اس تدریسی دور میں امام شافعی نے اپنا تصنیفی سلسلہ شروع کیا، اپنے مذہب قدیم کی کتاب ''الحجۃ'' اور ''الرسالہ'' (القدیمہ) اس دور میں تصنیف فرمائی۔

الرسالہ

امام ابوثورؒ فرماتے ہیں کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعیؒ سے بذریعہ خط درخواست کی کہ ان کے لئے ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی، قبولِ اخبار کے شرائط، اجماع کی حجیت اور قرآن وسنت کے ناسخ ومنسوخ کی وضاحت ہو؛ لہٰذا ان کے لئے حضرت نے الرسالہ لکھی، الرسالہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرماتے ہیں کہ میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں امام شافعیؒ کے لئے دُعا کرتا ہوں، الرسالہ درحقیقت بغداد سے ابن مہدی کی خدمت میں روانہ کردہ ایک جوابی خط ہے، اس لئے وہ ''الرسالہ'' سے مشہور ہوئی۔

ناصر السنۃ

قیامِ بغداد کے اس مرحلہ میں دلائل کے ساتھ سنت کی اہمیت پر امام شافعیؒ نے بڑا زور دیا، اسی لئے علماء وقت نے انھیں ''ناصر السنۃ'' کا لقب دیا۔

مصر میں قیام

۱۹۷ھ میں امام شافعی بغداد سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں سے ۱۹۸ھ میں پھر بغداد جاکر چند ماہ قیام

(۱) مناقب الشافعی للبیہقی: ۱ر ۲۲۵۔

کیا، پھر حجازِ مقدس لوٹے اور ۱۹۹ھ میں مصر کے لئے تشریف لے گئے، امام شافعی نے حجاز و یمن اور عراق کے علوم کو جمع کرلیا تھا، اب انھیں یہ شوق دامن گیر ہوا کہ مصر جا کر امام لیث بن سعد کے فقہ کو حاصل کریں، جن سے عدم ملاقات کا حضرت کو بڑا قلق تھا اور وہ ان کے فقہی شان کے بڑے معترف تھے، اپنی حیاتِ مقدسہ کے آخری چار سال میں مصر کے پرسکون ماحول میں اپنے مخلص تلامذہ کی مصاحبت میں اپنے مذہب جدید کی تدوین فرمائی۔

مصری تلامذہ

(۱) ابو یوسف بن یحییٰ ابو یعقوب البویطیؒ، (۲) اسماعیل بن یحییٰ المزنیؒ، (۳) ربیع بن سلیمان المرادیؒ۔

امام شافعی نے اپنے مذہب کے اُصول وفروع خود مدون فرمائے اور امام ربیع جیسے قابل شاگرد نے بڑی دقت وباریک بینی کے ساتھ بکثرت تلامذہ تک اسے منتقل کیا، جو امام شافعی کے کتب کی سماعت کے لئے مصر تشریف لاتے تھے۔

وفات

آخری ایام میں امام شافعی بواسیر کی شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے، بیماری کی شدت بڑھتی گئی اور ۲۰۴ھ ماہِ رجب کی آخری تاریخ کو شب جمعہ میں علومِ اسلام کا یہ عظیم وارث اپنے پیچھے علوم وکتب اور تلامذہ کی ایک بڑی جماعت کو چھوڑ کر اس دارِ فرانی سے کوچ کر گیا۔

امام شافعیؒ کا علمی مقام

امام ربیع فرماتے ہیں: ''فجر کی نماز کے بعد امام شافعی اپنے حلقہ میں بیٹھ جاتے تو اہل القرآن آجاتے، سورج نکلنے کے بعد وہ اُٹھ جاتے اور اہل الحدیث تشریف لاتے اور احادیث کی تفسیر ومعانی کے متعلق آپ سے سوالات کرتے، پھر سورج بلند ہونے کے بعد وہ اُٹھ جاتے اور حلقہ میں نظر ومذاکرہ شروع ہوجاتا، ارتفاعِ ضحیٰ کے بعد وہ چلے جاتے اور عربیت وعروض اور نحو وشعر کے شائقین کی مجلس کا سلسلہ نصف النہار کے قریب تک جاری رہتا، پھر حضرت الامام تشریف لے جاتے''۔(۱)

امام زعفرانیؒ اپنے شیخ کے حق میں فرماتے ہیں: ''میں نے قطعاً کسی کو امام شافعی سے بڑھ کر فصیح تر اور صاحبِ علم نہیں دیکھا، وہ اعلم وافصح تھے، ہر طرح کے اشعار ان کے روبرو پڑھے جاتے تو وہ اس سے واقف ہوتے، وہ تو بس ایک سمندر تھے''۔(۲)

(۱) مناقب الشافعی للبیہقی: ۲/ ۲۸۵۔ (۲) الانتقاء: ۱۴۸۔

تفسیر

قرآن کریم کے متعلق حضرت ''الرسالہ'' میں رقمطراز ہیں: ''اللہ جل شانہ نے جوبھی اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے، وہ رحمت وحجت ہے؛ لہٰذا طلبہ پر حق ہے کہ علوم قرآن کی تحصیل میں انتہائی کوشش کریں، اس راہ میں درپیش حالات پر صبر کریں، نصاً واستنباطاً علم قرآن کے حصول میں نیت اللہ تعالیٰ کے لئے خالص رکھیں، اس پر مدد کے لئے اللہ کی طرف رُجوع کریں؛ کیوں کہ جس نے اللہ کی کتاب کے احکام کا علم نصاً واستدلالاً حاصل کرلیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس علم کے مطابق قول وعمل کی توفیق بھی بخشی، وہ دین ودنیا میں فضیلت سے سرفراز ہوگا، اس سے شکوک وشبہات منتفی ہوں گے، اس کا قلب حکمت سے منور ہوگا اور دین میں امامت کے درجہ کا مستحق قرار پائے گا''۔(۱)

امام یونس بن عبدالاعلیٰ اپنے استاذ کے تفسیری مقام کے متعلق فرماتے ہیں کہ جب امام شافعی تفسیر شروع کرتے تو یوں معلوم ہوتا کہ وہ نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے۔(۲)

خود امام بیہقی نے امام شافعی کے تفسیری اقوال واحکام القرآن پر حضرت کی تحقیقات کو دو جلدوں میں جمع فرمایا، مفسر شہیر امام رازیؒ امام شافعیؒ کے تفسیری مہارت کے متعلق اپنی تفسیر کبیر کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''إن الشافعی کالبحر لا ساحل له فی هذا العلم'' آگے فرماتے ہیں: ''اعلم ! ان لطائف الشافعی فی علم التفسیر کثیرة''۔(۳)

حدیث

امام شافعی ابتداء ہی سے حرمین وغیرہ کے اکابرین محدثین سے علوم الحدیث کو حفظاً وفقہاً اور نقل اسانید کے ساتھ حاصل کرتے رہے اور ہر ایک میں کمال حاصل کیا۔

امام ابوالعباس الاصم نے امام شافعی کے کتب سے احادیث کو مسند الشافعی میں جمع فرمایا، جس میں تکرار کے حذف کے ساتھ باحصاء یوسف المرعشلی (۱۷۲۱) احادیث ہیں، اسی طرح امام طحاوی نے السنن میں امام شافعی کی احادیث کو جمع فرمایا، تاہم امام شافعی کے تمام کتب میں موجود احادیث وآثار کے سلسلہ میں جامع ترین کتاب امام بیہقی کی معرفة السنن والآثار ہے، صاحب ''المدخل'' کے بقول مذکورہ تینوں کتابیں اور ان پر قدیم وجدید علماء کی خدمات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ امام صاحب اپنے وقت کے کبار حفاظ حدیث میں سے تھے، اپنے استاد امام مالک اور شاگرد امام احمدؒ کے پایہ کے محدثین میں شامل تھے اور جہاں تک فقہ الاحادیث والآثار اور معانی واحکام کا معاملہ ہے تو اس میدان کے تو وہ شہسوار تھے۔(۴)

---

(۱) الرسالہ:۱۹۔ (۲) المناقب للبیہقی:۲۸۴۔ (۳) مناقب الامام للرازی:۱۳۵۔ (۴) المدخل:۱۳۹۔

بقول دکتور نورالدین عتر درایت علم الحدیث کے قواعد میں امام شافعی نے جو کچھ لکھا ہے، خواہ وہ الرسالہ میں ہو، یا اختلاف الحدیث کے مقدمہ میں، یا اپنے دیگر تصانیف میں، مدون شکل میں یہ علوم الحدیث میں سب سے قدیم سرمایہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔(۱)

استاذ احمد محمد شاکر ''الرسالہ'' میں موجود مباحث علوم الحدیث کی تعریف میں لکھتے ہیں: حدیث الواحد، اس کی حجیت، صحت حدیث وعدالت رواۃ کے شروط اور خبر مرسل ومنقطع کے رد اور دیگر مباحث پر امام شافعی نے جو روشنی ڈالی ہے یہ تمام مسائل اُصولِ حدیث کے دقیق ترین اور انتہائی قیمتی مباحث ہیں؛ بلکہ علوم حدیث میں درک رکھنے والا یہ محسوس کرے گا کہ بعد کی تمام تحریرات اسی کی فروع اور خوشہ چیں ہیں، اس کی اہمیت اس صورت میں مزید بڑھ جاتی ہے کہ کسی سابقہ مثال کو سامنے رکھے بغیر مستقل اپنے طور پر یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔(۲)

علم حدیث میں امام شافعی کے مقام اور امامت میں بعضوں کو جو شبہ ہوا ہے، رازی وبیہقی اور امام ابن ابی حاتم وخطیب بغدادی وغیرہ نے اس کی مدلل تردید کی ہے۔

فقہ

امام شافعی نے مکہ مکرمہ میں امام مسلم زنجیؒ وغیرہ سے فقہاء مکہ مکرمہ کے فقہ کو حاصل کیا، مدینہ منورہ میں امام مالک سے براہِ راست مدنی فقہ کی تحصیل کی، بغداد جاکر امام محمد بن الحسن سے ان کی کتابیں اور فقہ حنفی کو حاصل کیا، اسی طرح امام اوزاعی اور امام لیث وغیرہ اس وقت کے مشہور مجتہدین وائمہ فقہ کے علوم کو ان کے تلامذہ سے حاصل کیا اور پھر ان تمام علوم کو سامنے رکھ کر اپنی فقہ وکتب کی تدوین فرمائی۔

اس دور میں علمی ماحول دو طبقات پر منقسم تھا: (۱) اہل الحدیث، (۲) اہل الرأی، امام شافعی نے دونوں ہی کوچوں سے بھرپور استفادہ کرکے مدرسۃ الحدیث اور مدرسۃ الرأی کو ترتیب دے کر لوگوں کے سامنے ایک تیسرا مدرسہ پیش کیا، جس میں سنت صحیحہ کو بھی اپنا صحیح مقام دیا اور قیاسِ صحیح کو بھی تسلیم کیا گیا؛ لیکن نص کی فرع کی حیثیت سے، امام احمد کا یہ جملہ اسی حقیقت کی طرف مشیر ہے: ''ہم میں اور اہل الرأی میں اختلاف چلا آرہا تھا، امام شافعی نے آکر دونوں کو ملا دیا''۔(۳)

تصانیف الامام الشافعی

استقراء کی روشنی میں اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنے مذہب کے اُصول وفروع سے

---

(۱) منہج النقد فی علوم الحدیث لعتر: ٦٠۔ (۲) الرسالہ: ۱۳۔ (۳) ترتیب المدارک: ۱/۹۵۔

متعلق باقاعدہ تصنیف کا آغاز بغداد میں اپنی دوسری مرتبہ آمد کے وقت ۱۹۵ھ میں شروع کیا، حضرت کے تصانیف کو علماء کرام نے دوحصوں میں منقسم کیا ہے :

(۱) مصنفات العراقیہ : جن کو ۱۹۵ھ سے ۱۹۹ھ کے درمیان تصنیف کیا گیا، اس کو کتب قدیمہ کہا جاتا ہے، ان میں امام شافعی کے مذہب قدیم کی تفصیلات ہیں۔

(۲) مصنفات المصریہ : یعنی جن کی تصنیف ۲۰۰ھ تا ۲۰۴ھ کے درمیان عمل میں آئی، اس مدت کی کتابیں کتب جدید کہلاتی ہیں، جو امام شافعی کے مذہب جدید اور اقوالِ جدیدہ کی نمائندگی کرتی ہے۔

مصنفات مصریہ کا ایک بڑا حصہ مستقل تصنیف نہیں ہے؛ بلکہ عراقی کتب میں حذف واضافہ اور اصلاح کے ساتھ اس کی تجدید ہے، امام شافعی اپنی تصانیف کا مستقل نام نہیں دیا کرتے تھے، مثلاً وہ الرسالہ کی طرف ''کتابنا'' کہہ کر اشارہ کرتے تھے، ان تصانیف کے متداول نام ان کے ناقل تلامذہ کی طرف سے رکھے گئے ہیں، اسی لئے کبھی ایک ہی تصنیف کے متعدد نام نظر آتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے متعدد تصنیف ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔(۱)

امام شافعی کے بعض تصانیف کا کتب مناقب وغیرہ میں تذکرہ ہے؛ لیکن فی الوقت بظاہر وہ مفقود ہیں۔

الرسالہ

امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے امام شافعی سے درخواست کی تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھیں جس میں معانی القرآن، احادیث کی قبولیت کے شرائط، اجماع کی حجیت اور قرآن وسنت کے ناسخ ومنسوخ کا ذکر ہو تو انھوں نے الرسالہ قلمبند کر کے حارث بن سریج کے ذریعہ ان کی خدمت میں روانہ کردیا۔

امام عبدالرحمٰن بن مہدی کے متعلق امام ترمذیؒ نے اپنی علل میں امام احمد کے الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ وہ ''امام'' ہیں، نیز امام علی بن بن مدینی (جو کہ امام بخاری کے عظیم ترین استاذ ہیں، جن کے متعلق خود امام بخاری کے الفاظ ہیں کہ میں نے ان کے علاوہ کسی کے روبرو خود کو چھوٹا محسوس نہیں کیا) سے اپنی سنن اور علل میں نقل فرمایا کہ اگر مجھے حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان قسم دلائی جائے تو میں قسم لوں گا کہ میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

امام شافعی نے مصر جانے کے بعد اسے از سرنو ترتیب دیا اور فی الحال لوگوں کے سامنے یہی ''الرسالۃ الجدیدۃ'' موجود ہے۔

---

(۱) المدخل للقواسمی۔

اُصول میں اولین کتاب

اُصولِ حدیث اور اُصولِ فقہ پر ''الرسالہ'' با قاعدہ اولین تصنیف ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعی سے قبل علماء اُصولِ فقہ کے مسائل میں گفتگو کیا کرتے، استدلال واعتراض کرتے تاہم دلائل شرعیہ کی معرفت کے لئے ان کے پاس کوئی کلی قانون نہیں تھا، (یعنی مرتب شکل میں) اور نہ معارضات وترجیحات کی کیفیت کے سلسلہ میں کوئی اُصول مرتب تھا؛ لہٰذا امام شافعی نے اُصولِ فقہ کا علم مستنبط کیا اور لوگوں کے سامنے شرعی دلائل کے مراتب کی معرفت کے لئے کلی قانون وضع فرمایا، جسے اپنا مرجع بنایا جا سکے۔(۱)

امام زرکشیؒ فرماتے ہیں: اُصولِ فقہ میں سب سے پہلے امام شافعی نے کتابیں تصنیف فرمائیں، اس فن میں الرسالہ، احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان، جماع العلم اور کتاب القیاس تصنیف فرمائیں۔(۲)

الدکتور احمد سعید حوّی ''المدخل إلی مذهب الإمام ابی حنیفة النعمان'' میں فرماتے ہیں :

> يعتبر الإمام الشافعي أول من دون علم اصول الفقه بشكل متكامل ، ولا نعلم احداً قبل الشافعي دون اصول الفقه بهذه الطريقة ۔ (۳)

الدکتور مرتضیٰ علی داغستانی نے اپنی المدخل میں استاذ مکرم دکتور مصطفیٰ الخن حفظہ اللہ سے نقل فرمایا :

> وفي رأيي أن عزو البداءة في التصنيف في هذا العلم إلى غير الشافعي إن هو إلا خرق للإجماع أو قريب من ذلک من غير برهان ولا دليل مقنع ۔ (۴)

''الامام الشافعی'' میں شیخ عبدالغنی الدقر لکھتے ہیں :

> أجمع العلماء والفقهاء : أن أول من ابتدع علم الأصول الشافعي ۔ (۵)

امام عبدالرحمٰن بن المهدی کے پاس جب الرسالہ پہنچی تو تعجب سے کہنے لگے :

> لو كان أقل لنفهم ، لو كان أقل لنفهم ۔ (۶)

---

(۱) مناقب الشافعی: ۵۷۔ (۲) البحر المحیط: ۱۸۔
(۳) المدخل: ۱۱۹۔ (۴) المدخل إلی اصول الامام الشافعی من خلال تحفۃ المحتاج: ۱/ ۱۳۶۔
(۵) الامام الشافعی: ۲۲۷۔ (۶) طبقات الشافعیہ: ۲/ ۱۱۲۔

آگے فرمایا :

لما نظرت الرسالة للشافعي اذ هلتني ؛ لأني رأيت كلام رجل عاقل فصيح ناصح ، فإني لا كثر له الدعاء ۔ (۱)

نیز فرمایا :

ما ظننت أن الله خلق مثل هذا الرجل ۔ (۲)

امام مزنیؒ فرماتے ہیں : میں نے الرسالہ کا ۵۰۰ مرتبہ مطالعہ کیا اور ہر مرتبہ اس سے کچھ نہ کچھ نیا فائدہ حاصل ہوا۔

ایک روایت میں ہے : میں ۵۰ سال سے اس کا مطالعہ کررہا ہوں ، اور جب بھی اس کا مطالعہ کیا کسی ایسی چیز کا مجھے علم حاصل ہوا ، جس سے میں پہلے واقف نہ تھا ، (۳) اور امام یحییٰ بن سعید القطان کے سامنے جب الرسالہ پیش ہوئی تو فرمایا : میں نے ان سے بڑھ کر عقلمند یا فقیہ کسی کو نہیں دیکھا ۔ (۴)

ملخص الرسالۃ

ابتداء بکثرت آیات کی روشنی میں نزول قرآن کے وقت کے حالات اور نزولِ قرآن کے مقاصد کی تعیین کر کے علم قرآن کی اہمیت کو ثابت کیا ، پھر آیات قرآنیہ کی روشنی میں واضح فرمایا کہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم میں موجود ہے : ''وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ '' (النحل : ۸۹) پھر بیان کی تشریح کے بعد قرآن مجید سے ثابت احکام کے مدارج قائم فرمائے ۔

(۱) جسے اللہ تعالیٰ نے نصاً بیان فرمایا ، مثلاً نماز ، زکوٰۃ ، حج وروزہ کی فرضیت ، زنا ، شراب ، مردار وخنزیر کی حرمت ۔

(۲) جس کی فرضیت تو قرآن سے ثابت ہے ؛ لیکن کیفیت وتشریح احادیث کی روشنی میں سمجھائی گئی ، مثلاً : نماز کی تعداد ، وقت ، زکوٰۃ کا نصاب ومقدار اور وقت وغیرہ ۔

(۳) وہ احکام جن کا احادیث میں تذکرہ ہے ، قرآن کریم نے نصاً ذکر نہیں کیا ؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضور اکرم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے ؛ لہٰذا یہ تمام احکام بھی الٰہی احکام ہیں ۔

(۴) بعض احکام میں اجتہاد کا حکم دیا ہے ، قرآن میں دنیا کے ہر خطہ سے بوقت نماز قبلہ رُخ ہونے کا حکم ہے

(۱) توالی التاسیس : ۵۵ ۔
(۲) مرآۃ الجنان : ۲/ ۱۸ ، الامام الشافعی : ۲۳۰ ۔
(۳) المجموع : ۱/ ۱۶ ۔
(۴) تہذیب الاسماء واللغات : ۱/ ۵۹ ۔

تو گویا بعید حضرات کے لئے متعلقہ دلائل کے ذریعہ اجتہاد کر کے قبلہ کے رُخ کی تعیین کا حکم دیا، محرم کے شکار کی صورت میں جزاء کے مثل کے لئے دو عادل کے اجتہاد پر عمل کا حکم دیا۔

(۵) خلاصہ یہ کہ حلال وحرام میں گفتگو بلا علم ناجائز ہے اور جہت علم ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔

القیاس

القياس ما طلب بالدلائل على موافقة الخبر المتقدم عن الكتاب والسنة۔

(۱) منصوص تحلیل یا تحریم کسی معنی کی وجہ سے ہوگی، سو غیر منصوص میں وہ معنی ہو تو وہاں بھی وہی حکم جاری ہوگا۔

(۲) الالحاق بأولی الاشیاء شبہا بہ۔

لیکن قیاس کی گنجائش کس صورت میں ہوگی؟ فرماتے ہیں :

ولكنها منزلة ضرورة ؛ لأنه لا يحل القياس والخبر موجود كما يكون التيمم طهارة في السفر عند الاعواز من الماء ، ولا يكون طهارة إذا وجد الماء ۔ (۱)

النسخ

کتاب کا نسخ کتاب کے ذریعہ ہوگا، سنت کتاب کی ناسخ نہ ہوگی، سنت تو کتاب کے تابع ہے، اسی طرح سنت کو سنت ہی نسخ کرے گی، اگر کوئی سنت قرآن سے منسوخ ہو تو اس کے متعلق کوئی سنت بھی ہوگی جو اس کی وضاحت کرے گی کہ اس دوسری سنت کے ذریعہ پہلی سنت منسوخ ہو چکی۔

عند الاختلاف بین الاحادیث

یا تو تطبیق دیں گے، یا کتاب وسنت اور دیگر شواہد کی روشنی میں ترجیح دیں گے؛ لہٰذا فرمایا :

ولم نجد عنه حديثين مختلفين إلا ولهما مخرج ، أو على أحدهما دلالة بأحد ما وصفت إما بموافقة كتاب أو غيره من سنة أو بعض الدلائل ۔

---

(۱) الرسالہ:۶۰۔

نیز فرمایا :

عند الاختلاف فی الحدیث لم نذهب إلی واحد منهما إلا بسبب یدل علی انه اقوی أی أن یکون احد الحدیثین اشبه بکتاب الله ، فإن لم یکن فیه نص کتاب الله کان أو لا هما بنا الاثبت منهما وذلک أن یکون مما رواه اعرف اسناد أو اشهر بالعلم واحفظ له ، أو یکون الحدیث الذی ذهبنا الیه من وجهین أو اکثر ، والذی ترکناه من وجه فیکون الأکثر اولی بالحفظ من الأقل أو یکون الذی ذهبنا إلیه أشبه بمعنی کتاب الله أو اشبه بما سواهما من سنن رسول الله صلی الله علیه وسلم أو أولی بما یعرف اهل العلم أو أصح فی القیاس والذی علیه الاکثر من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم (الامثلة : وقت الفجر ، الإستقبال والاستدبار ، غسل یوم الجمعة ، الخطبة علی الخطبة) ۔

خبر الواحد عن الواحد حتی ینتهی به إلی النبی صلی الله علیه وسلم أو من انتهی به الیه دونه متی تکون حجة : أن یکون من حدث به ثقة فی دینه معروفا بالصدق فی حدیثه عاقلا لما یحدث به عالما بما یحیل معانی الحدیث من اللفظ (أی ان روی بالمعنی) و أن یکون (أی أو أن یکون) ممن یؤدی الحدیث بحروفه کما سمع ... حافظاً ان حدث به من حفظه حافظاً لکتابه أن حدث من کتابه إذا شرک اهل الحفظ فی الحدیث وأفق حدیثهم بریئاً من أن یکون مدلساً ... ویکون هکذا ۔

الحجة فی تثبیت خبر الواحد

خبر واحد کی حجیت پر امام شافعیؒ نے کافی دلائل قائم فرمائے ہیں، مثلاً :

نضر الله عبداً ، لا ألفین ، تحویل قبله ، تحریم الخمر ، اعلان حجة الوداع ، ان هذه أیام طعام و شراب ، فلا یصو من احد ، وقد فرق النبی صلی الله علیه وسلم ، عمالا علی نواحی ، بعث

معاذاً إلى اليمن ، قبول عمر حديث توريث المرأة في دية الزوج ، وحديث الطاعون ، رجوع زيد عن قول وجوب طواف الوداع على الحائض لحديث ابن عباس ۔

فرماتے ہیں :

لم أحفظ عن فقهاء المسلمين أنهم اختلفوا في تثبيت خبر الواحد ۔

نیز فرمایا :

وجب على الناس ترك كل عمل وجدت السنة بخلافه ۔

المرسل

شرائط قبول مرسل كبار التابعين عند الشافعي : موافقة المسند له أو المرسل غيره (ولكن هذا أضعف من الأول) أو رواية بعض الصحابي قولاً له ، أو عوام أهل العلم يفتونه بمثل ماروى ... ثم يعتبر بأن يكون إذا سمى من روى عنه لم يسم مجهولاً ولا مرغوباً عن الرواية عنه ، ويكون إذا شرك احداً من الحفاظ في حديثه لم يخالفه فإن خالفه وجد حديثه أنقص ، كانت في هذه دلائل على صحة مخرج حديثه و إلا اضر بحديثه ولا نستطيع ان نزعم ان الحجة تثبت به ثبوتها بالمتصل ... فأما من بعد كبار التابعين الذين كثرت مشاهدتهم لبعض اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا أعلم منهم واحداً يقبل مرسله ۔

جواب اشکال

امام شافعیؒ اپنی کتابوں میں استدلال میں منقطع احادیث کو بھی پیش کرتے ہیں اس پر وارد اشکال کا جواب دیتے ہوئے ''الرسالہ'' میں فرماتے ہیں :

وكل حديث كتبته منقطعا فقد سمعته متصلا أو مشهورا عن من روى عنه بنقل عامة من أهل العلم يعرفونه عن عامة

ولکن کرهت وضع حديث لا أتقنه حفظاً وغاب عنی بعض کتبی و تحققت بما يعرفه أهل العلم مما حفظت فاختصرت خوف طول الکتاب فأتيت ببعض ما فيه الکفاية دون تقصی العلم فی کل أمرة ۔ (۱)

قول الصحابی

قولِ صحابی قدیم قول میں حجت ہے، جدید میں حجت نہیں: ''و إليه ذهب جمهور الأصوليين من أصحابنا''، لیکن الام اور بیہقی کے نقل جدید میں اسے حجت قرار دیا ہے، اختلاف مالک میں فرماتے ہیں :

والعلم طبقات : (۱) الکتاب والسنة إذا ثبت ، (۲) الاجماع مما ليس فی کتاب ولا سنة ، (۳) أن يقول بعض اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم ولا نعلم له مخالفاً منهم ، (٤) اختلاف اصحاب الرسول صلی الله عليه وسلم ، (۵) القياس علی بعض هذه الطبقات ، هذا نصه بحروفه ورواه البيهقی ۔ (۲)

امام شافعیؒ کے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت اور اجماع کے بعد چوتھے نمبر پر اقوال صحابہ سے استدلال ہے اور قیاس پر مقدم ہے، اقوالِ صحابہ سے استدلال میں ترتیب حسب ذیل ہے :

اگر صحابہ کسی بات پر متفق ہیں تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

اگر صحابہ کا اختلاف ہو تو جو کتاب وسنت سے اقرب ہو، یا قیاس کے مطابق ہو اسے اختیار کیا جائے گا ورنہ پھر صدیق وفاروق اور عثمانؓ کا قول مقدم ہوگا؛ لہٰذا ''الام'' میں فرماتے ہیں :

أقول ما کان الکتاب والسنة موجودين فالعذر عمن سمعهما مقطوع إلا باتباعهما فإذا لم يکن ذلک صرنا إلی أقاويل أصحاب رسول الله صلی الله عليه وسلم أو واحد منهم ثم کان قول الأئمة أبی بکر أو عمر أو عثمان إذا صرنا فيه إلی التقليد أحب إلينا وذلک إذا لم نجد دلالة فی الاختلاف تدل علی أقرب الاختلاف من الکتاب والسنة ۔ (۲)

---

(۱) الرسالہ:۱؍۴۳۱۔ (۲) البحر المحیط للزرکشی:۶؍۵۵۔ (۲) الام:۹؍۳۵۷،کتاب اختلاف مالک والشافعی۔

ایک جگہ فرمایا :

ما اختلف فیه بعض اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم اخذنا منه أشبهه بالتنزیل ۔ (۱)

صحابہ کرام کے اختلاف کی صورت میں لکھتے ہیں :

ولو اختلف بعض اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم فی شیئ کان اصل ما نذهب الیه انا نأخذ بقول الذی معه القیاس ۔ (۲)

الام میں محرم کے شکار کی صورت میں فدیہ کے متعلق صحابہ کرام کے اختلاف کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

إذا کان هذا هکذا فإنما فیه اتباعهم لأنا لا نتوسع فی خلافهم إلا إلی مثلهم ولم نعلم مثلهم خالفهم ۔

اور میراث الجد کے باب میں لکھتے ہیں :

قلنا : لم نتوسع بخلاف ما روینا عنه من أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم إلا أن نخالف بعض إلی قول فنکون غیر خارجین من اقاویلهم ۔ (۳)

اور مکہ مکرمہ کے کبوتر کے فدیہ کے متعلق بعض آثار نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

من أصاب من حمام مکة بمکة حمامة ففیها شاة إتباعاً لهذه الآثار التی ذکرنا عن عمر ، وعثمان وابن عباس وابن عمر وعاصم بن عمر وعطاء وابن المسیب لا قیاساً ۔ (۴)

الام میں دیگر بھی کئی مسائل میں امام شافعی قولِ صحابی کے مطابق فتویٰ دے رہے ہیں، تاہم کسی بھی صحابی کے قول سے ہٹ کر سنت ثابت ہو تو ہر حال میں اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

وهکذا ینبغی لنا ولکم أن لا نترک عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ابداً لقول غیره ۔ (۵)

---

(۱) الام: ۸/ ۳۳۲-۳۳۳، کتاب الاقضیہ۔

(۲) الام: ۸/ ۴۳۶، بیع الآجال۔

(۳) الام: ۴/ ۸۵۔

(۴) الام، فدیۃ الحمام: ۱/ ۳۵۱۔

(۵) الام، باب دیۃ الاسنان۔

اور ایک جگہ فرمایا :

ولا يجوز لعالم أن يدع قول النبى لقول صلى الله عليه وسلم أحد سواه۔

لہٰذا بعض محققین کے نزدیک قول جدید میں قولِ صحابی کو حجت نہ سمجھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

الاستحسان

امام شافعیؒ اپنی کتاب میں استحسان کی تردید کرتے ہیں بلکہ ''ابطال الاستحسان'' نامی مستقل ایک رسالہ بھی تصنیف فرمایا ہے؛ البتہ اس کے متعلق ابن سمعانی فرماتے ہیں :

إن كان الاستحسان هو القول بما يستحسنه الإنسان ويشتهيه من غير دليل فهو باطل ولا احد يقول به۔

پھر فرمایا :

ان الخلاف بيننا وبينهم لفظى ، فإن تفسير الاستحسان بما يشنع عليهم لا يقولون به والذى يقولون به إنه العدول فى الحكم من دليل إلى دليل هو أقوى منه ، فهذا مما لم ينكره وأحسن تفسيره ما قاله ابوالحسن الكرخى : انه قطع المسائل عن نظائرها لدليل خاص يقتضى العدول عن الحكم الأول فيه إلى الثانى ، سواء كان قياساً أو نصاً يعنى ان المجتهد يعدل عن الحكم فى مسئلة بما يحكم فى نظائرها إلى الحكم بخلاف لوجه يقتضى العدول عنه۔ (۱)

تصانیف الشافعی

امام شافعی ۲۰۴ھ میں اپنے پیچھے جید تلامذہ کی ایک جماعت اور ایک ضخیم تصنیفی ذخیرہ چھوڑ کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے، اس کے بعد اس سلسلہ کو آئندہ علماء شافعیہ نے قرناً بعد قرن جاری وساری رکھا، امام شافعیؒ کے ایک اہم تلمیذ امام مزنیؒ نے المختصر الصغیر، مختصر المزنی لکھی اور یہ کتاب ایک طرح صدیوں پر محیط مصنفاتِ شافعیہ کے سلسلہ کے لئے پہلی کڑی ثابت ہوئی، یہ کسی حد تک ''الام'' کا اختصار ہے۔

---

(۱) البحر المحیط: ۹۱/۶۔

امام ابن سریج فرماتے ہیں :

یخرج مختصر المزنی من الدنیا عذراء لم یفتض ، وھو اصل الکتب المصنفة فی المذھب الشافعی وعلی مثاله رتبوا ولکلامه فسروا وشرحوا۔

یہ فقہ شافعی کی پانچ متداول متون میں سے ایک ہے: مختصر المزنی، المہذب، التنبیہ، الوسیط اور الوجیز۔

مختصر المزنی کی بکثرت شروحات ہیں: ''الحاوی الکبیر للماوردی'' اور ''نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب للامام الحرمین'' زیادہ مشہور ہیں، النہایہ کا امام غزالیؒ نے بالترتیب الوسیط ، البسیط اور الوجیز اور خلاصہ میں اختصار کیا، الوجیز پر امام رافعیؒ کی ایک چھوٹی اور بڑی شرح ہے، ''الشرح الکبیر'' کا مشہور نام ''فتح العزیز'' ہے، فتح العزیز میں موجود دیگر مذاہب اور دلائل کو حذف کر کے امام نوویؒ نے ''روضۃ الطالبین'' کے نام سے اس کا اختصار کیا، بعض مسائل کی ترجیح میں اختلاف کیا اور چند مسائل کا اضافہ کیا اور اپنی بات کی ابتداء میں ''قلت'' اور انتہاء میں ''واللہ اعلم'' لکھ کر اپنی بات کو نمایاں کیا، الروضہ کو ''الشرف بن المقری الیمنی'' نے ''الروض'' (روض الطالب) میں مختصر کیا، اس پر شیخ الاسلام زکریا الانصاریؒ نے ''اسنی المطالب'' نامی شرح لکھی، المزجد نے ''العباب'' میں ''الروضۃ'' کا اختصار کیا، جس پر ابن حجر مکیؒ نے ''الایعاب'' نامی بڑی جامع و بہترین شرح لکھی، امام اسنویؒ نے ''المہمات'' کے نام سے ''الروضۃ'' پر ایک جلیل القدر تعلیق پیش کی۔

المحرر

امام رافعیؒ نے امام غزالیؒ کے مذکورہ بالا کتب ثلاثہ (وسیط ، بسیط ، وجیز) کا خلاصہ ''المحرر'' میں پیش کیا۔

منہاج الطالبین

المحرر کو امام نوویؒ نے حذف و اضافہ کے ساتھ ''منہاج الطالبین'' میں کچھ اختصار کے ساتھ پیش کیا اور ''روضۃ الطالبین'' کی طرح اپنے اختلاف واضافہ کو نمایاں کیا، یہ فقہ شافعی کے اہم ترین متون میں شامل ہے، اس کی علماء شافعیہ نے مختلف ناحیہ سے بڑی خدمت انجام دی ہے، السبکی ، القایانی ، المحلی ، الاذرعی ، ابن الملقن ، الاسنوی ، الاردبیلی ، البلقینی ، الشرف الغزی ، السیوطی ، المادرینی ، زکریا الانصاری ، البدر بن قاضی شہبہ ، ابن قاضی عجلون ، الشمس الرملی ، الخطیب الشربینی اور ابن حجر مکی رحمہم اللہ نے اس پر ضخیم اور جلیل القدر شروح لکھیں ، شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے ''منہج الطلاب'' کے نام سے اس کا اختصار کیا، منہاج کی طرح غیر راجح کی طرف اشارہ نہیں ہے، صرف راجح پر اکتفاء کیا ہے، کہیں ترجیح میں امام نوویؒ سے اختلاف بھی کیا ہے، اس پر مصنف کی شرح فتح الوہاب

موجود ہے،جس پر شیخ سلیمان الجمل کا بہترین حاشیہ موجود ہے،جس میں منہاج کی شروح اور دیگر کتب کا خلاصہ پیش کردیا ہے،جس کا نام ''فتوحات الوہاب بتوضیح شرح منہج الطلاب'' ہے۔

رملیؒ کی نہایۃ المحتاج ، ابن حجرؒ کی تحفۃ المحتاج ،خطیب کی مغنی المحتاج اور شیخ زکریا انصاریؒ کی منہج ان چاروں کتب پر شافعی مذہب کا دارومدار ہے۔

کتب شافعیہ کی تنقیح

امام شافعیؒ کی وفات کے بعد چار صدیوں میں دنیا کے مختلف خطوں میں علمائے شوافع نے بکثرت اُصولی وفقہی کتابیں لکھیں ،بعض مسائل میں ان کتب کے مابین ترجیح وتخریج میں اختلاف تھا اور بقول امام نوویؒ اسی وجہ سے مذہب کی تحقیق عام علماء کے بس کی بات نہیں تھی ،صرف اعلیٰ درجہ کے محققین ہی کا یہ کام تھا ؛ لہٰذا ہمارے متأخرین اصحاب میں سے امام رافعیؒ (م: ۶۲۳ ھ) کواللہ تعالیٰ نے خدمت تنقیح کے لئے منتخب کیا اور موصوف نے بالخصوص اپنی شرح الوجیز میں بالاستیعاب ایجاز واتقان اور واضح عبارات کے ساتھ مذہب کی بہترین تنقیح فرمائی۔

امام رافعیؒ کے انتقال کے تقریباً آٹھ سال بعد ۶۳۱ ھ میں امام نوویؒ دنیا میں تشریف لائے اور تمام علوم دینیہ میں بالعموم اور فقہ شافعی میں بالخصوص تبحر حاصل کیا اور ان کی امامت وجلالت شان پر سب کا اتفاق تھا،کتب شافعیہ پر ان کی نظر بڑی دقیق تھی ، انھوں نے آکر امام رافعی کے تنقیح کے سلسلے کو تکمیل تک پہنچایا ، ان کی روضۃ الطالبین اور منہاج کا تذکرہ گذر چکا،موصوف کی ایک مشہور تصنیف ''المجموع'' ہے جو الفقہ المقارن میں ایک موسوعہ کی حیثیت رکھتی ہے،اس میں انھوں نے امام ابواسحاق شیرازیؒ کی ''المہذب'' کی تشریح کی ہے،تاہم تکمیل سے قبل ہی رحلت فرماگئے،اپنی مجموع کے مقدمہ میں ترجیحات کے اُصول کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

امام ابن حجر مکیؒ اپنی تحفۃ المحتاج میں فرماتے ہیں :

> کسی مسئلہ میں شیخین (نووی اور رافعی) سے مقدم کسی کتاب پر خوب بحث وتحقیق کے بعد ہی اعتماد کیا جاسکتا ہے؛ جب کہ شیخین یا کسی ایک نے اس مسئلہ سے تعرض نہ کیا ہو، ورنہ متأخرین کا قرناً بعد قرن اس پر اتفاق ہے کہ شیخین جس پر متفق ہوں ، وہی معتمد ہوتا ہے، (سوائے ایسی صورت کے جب کہ بالاتفاق ان سے سہو ہوا ہو ؛لیکن ایسا شاید ہی ہوا ہو) ،اگر شیخین میں اختلاف ہوتو پھر مصنف (یعنی نوویؒ) پر اعتماد ہوگا، اگر امام نوویؒ سے کچھ منقول نہ ہوتو پھر امام رافعیؒ کی بات پر اعتماد ہوگا۔(۱)

(۱) تحفۃ المحتاج:۱/ ۶۵۔

تنقیح ثانی ۶۷۷ھ میں امام نوویؒ کے انتقال کے بعد سے ۹۲۶ھ میں شیخ زکریا انصاریؒ کے وصال تک اکابر علماء شافعیہ نے بکثرت کتابیں لکھیں، اس دور کی کتابوں کی تنقیح کا عمل ابن حجر ہیثمی اور شمس الدین الرملیؒ کے ذریعہ مکمل ہوا اور آئندہ کے فقہائے شافعیہ کا ترجیح وفتویٰ میں اصل اعتماد انھیں دو حضرات پر ہے اور بقول علامہ کردیؒ ان دونوں کے خلاف؛ بلکہ ابن حجر کی تحفۃ المحتاج اور رملیؒ کی نہایۃ المحتاج کے خلاف فتویٰ دینا درست نہیں ہے، ان دونوں کا بعض ترجیحات میں اختلاف ہے، جسے شیخ علی باصبرین نے ''اثمد العینین فی بعض اختلاف الشیخین ابن حجر الھیتمی والشمس الدین الرملی'' نامی رسالہ میں جمع فرمایا ہے۔

ان دونوں حضرات کی تنقیح وترجیح میں اصل اعتبار امام نوویؒ کی تنقیح پر کیا گیا ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ دونوں کی سب سے اہم کتاب تحفہ اور نہایہ امام نوویؒ کی منہاج کی شرح ہے، جن مسائل سے شیخین نے تعرض نہیں کیا، ان میں ان دونوں حضرات نے اجتہاد کر کے مسئلہ بیان کیا ہے۔

کتب شافعیہ میں ترجیح وترتیب

اس کا کچھ ذکر ماقبل میں گذر چکا ہے، اگر امام نوویؒ کی کتابوں میں اختلاف ہو تو غالباً یہ ترتیب ہوگی: تحقیق، مجموع، تنقیح، روضہ اور منہاج اور فتاویٰ، شرح مسلم، تصحیح التنبیہ اور نکت التنبیہ۔

اگر شیخین سے ترجیح منقول نہ ہو اور مفتی ترجیح کا اہل نہ ہو تو شیخ محمد الرملی کی النہایہ اور شیخ ابن حجر مکی کی التحفہ پر اعتماد کرے، پھر یہ ترتیب: ابن حجر کی فتح الجواد، امداد، شرح العباب اور فتاویٰ، تاہم شرح بافضل آخری دونوں پر مقدم ہوگی، جن مسائل سے ان دونوں نے تعرض نہ کیا ہو ان میں یہ ترتیب ملحوظ رہے گی :

شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ کی بہجہ، شرح صغیر، فتح الوہاب (لیکن اس میں بعض مسائل ضعیفہ ہیں)، پھر خطیب، پھر حاشیہ الزیادی، فابن قاسم، فعمیرہ، فشبر املسی، فحلبی، فشوبری، پھر عنانی کا کلام معتبر ہوگا؛ جب کہ یہ حضرات اُصول مذہب کی مخالفت نہ کریں۔

تحفہ اور نہایہ میں اختلاف ہو اور مفتی میں ترجیح کی اہلیت نہ ہو تو اسے اختیار ہے۔

(۱) تحفہ، نہایہ اور دیگر مذکورہ کتب میں بعض غلط یا کافی ضعیف مسائل آ گئے ہیں، ان پر فتویٰ جائز نہیں ہے۔

(۲) کسی قول کو ترجیح دینے اور اختیار کرنے کی جن میں صلاحیت ہو، مثلاً: امام نوویؒ، امام ابن منذرؒ، امام سیوطیؒ ان کے اختیارات اور ترجیح پر عمل کرنا جائز ہے۔

(۳) ایک مسلک سے کسی دوسرے مدون مسلک کی طرف منتقل ہونا جائز ہے، بعض مسائل میں منتقل ہو تو شرط ہے کہ تلفیق لازم نہ آئے۔

(۴) کسی حاجت یا عام مصلحت کی وجہ سے مرجوح قول پر فیصلہ وفتویٰ جائز ہے، مثلاً: نفقہ کی حاجت کی وجہ سے مجبر ولی کی عدم موجودگی میں صغیرہ ثیبہ کے نکاح کی صحت، لوگوں کے حقوق کی ادائیگی وحفاظت کے لئے فاسقین کی گواہی پر فیصلہ۔

(۵) جو عامی کسی مسلک کا پیروکار ہو، اسے اس مسلک کے راجح قول پر عمل کرنا لازم ہے، اسے مرجوح پر فتویٰ دینا اور اس کا مرجوح پر عمل کرنا حرام ہے، جب کہ کوئی حاجت یا مصلحت اس کی مقتضی نہ ہو۔(۱)

مصطلحات الشافعیہ

اقوال : امام شافعیؒ سے ایک سے زائد اجتہادات وارد ہوں تو اسے اقوال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو قول مصر کے قیام سے پہلے وارد ہوا سے قول قدیم یا مذہب قدیم کہا جاتا ہے اور جو مصر کے قیام کے دوران وارد ہو، اسے قول جدید یا مذہب جدید کہا جاتا ہے۔

الاظہر : ایک سے زائد اقوال میں جو راجح ہو، اسے اظہر سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ جب کہ بالمقابل کا قول بھی فی الجملہ قوی ہو۔

المشہور : اگر ایک سے زائد اقوال میں راجح کے بالمقابل قول ضعیف ہو تو راجح کے لئے مشہور کی اصطلاح مستعمل ہوتی ہے۔

اصحاب : جو فقہائے شافعیہ امام شافعیؒ کے اُصول کی روشنی میں اجتہاد واستنباط کی قدرت کے حامل ہوں، انھیں اصحاب کہا جاتا ہے۔

وجوہ : اصحابِ شافعیہ کے اجتہاد واستنباط کو وجہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

طرق : مذہب کے نقل میں اصحاب کا اختلاف، مثلاً: بقول بعض مسئلہ میں دو قول ہیں، جب کہ بعض دیگر کے نزدیک ایک ہی قول ہے۔

المذہب : طرق میں جو راجح ہو۔

الاصح : اصحاب شافعیہ سے منقول وجوہ میں جو راجح ہو؛ جب کہ بالمقابل وجہ بھی فی الجملہ قوی ہو۔

الصحیح : منقولہ وجوہ میں جو راجح ہو، جب کہ بالمقابل وجہ ضعیف ہو۔

النص : جسے امام شافعی نے صراحتاً اپنی کتاب میں لکھا ہو۔

---

(۱) قلائد الخرائد: ۱/ ۷۴۴، ترشیح المستفدین: ۳، فتح المعین مع الاعانۃ: ۴/ ۱۷، بغیۃ المسترشدین: ۱۰۶۔

التخریج : اگر امام شافعی دو مشابہ مسئلہ میں الگ الگ جواب دیں، پھر اصحاب ایک جواب کو مشابہت کی وجہ سے دوسرے مسئلہ میں نقل کریں تو اسے تخریج کہا جائے گا۔

الاشبہ : کسی مسئلہ میں دو جدا جدا قیاس کی وجہ سے دو حکم منقول ہوں، تو ان میں جو قوی تر ہوا سے الاشبہ کہا جائے گا۔

الامام : امام الحرمین الجوینی (م:۴۷۸ھ)۔

القاضی : قاضی حسین (م:۴۶۲ھ)۔

القاضیان : الرویانی (م:۵۰۲ھ)، والماوردی (۴۵۰ھ)۔

الشارح،الشارح المحقق : جلال الدین المحلی (م:۸۶۴ھ)۔

الشیخان : النووی (م:۶۷۶ھ)، والرافعی (م:۶۲۳ھ)۔

الشیوخ : الرافعی،النووی وتقی الدین السبکی (م:۷۵۶ھ)۔

المحمدون الاربعة : محمد بن نصر المروزی (م:۲۹۴ھ)،محمد بن ابراہیم المنذر (م:۳۱۰ھ)،محمد بن جریر الطبری (م:۳۱۰ھ) اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ (م:۳۱۱ھ)۔

● ● ●

حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ
دل دردمند اور فکر ارجمند کا حسین امتزاج

خالد سیف اللہ رحمانی

دسمبر۱۹۹۴ء کی بات ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا چھٹا سیمینار گجرات کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم ماٹلی والا میں منعقد ہوا، دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور وہاں کے دو ممتاز اساتذۂ حدیث حضرت مولانا عبدالحنان صاحبؒ (بانی: جامعہ قاسمیہ بالا ساتھ مظفرپور، بہار) اور حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی (موجودہ مہتمم جامعہ تعلیم القرآن جمبوسر) اس سیمینار کے محرک تھے، اس حقیر کے لئے یہ سیمینار گجرات کے پہلے سفر کا ذریعہ بنا، وہاں کے مدارس کو دیکھنے اور بالخصوص حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ سے ملاقات کرنے کی غرض سے میں ایک دن پہلے دارالعلوم ماٹلی والا پہنچ گیا، اور دیدۂ شوق لے کر خاص طور پر دو مدرسوں میں حاضر ہوا، ایک: جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، جہاں اس وقت میرے محبوب استاذ حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ شیخ الحدیث تھے، دوسرے: جامعہ فلاح دارین ترکیسر، یہاں جب دفتر میں پہنچا تو حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ اور حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھولیویؒ محو گفتگو تھے، دونوں بزرگوں سے ملاقات ہوئی، مولانا ابرار احمد صاحب نے بڑی وجیہ شکل پائی تھی، اور مولانا کے سر پر اونچی دوپلی ٹوپی اس وجاہت کو دوبالا کر رہی تھی۔

دوسری شخصیت حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ کی تھی، روشن چہرہ، کشادہ پیشانی، زیادہ سفید اور کچھ سیاہ بال پر مشتمل ہلکی داڑھی، چار کلیوں والی ٹوپی جو عام طور پر گجرات میں پہنی جاتی ہے، سفید لمبا کُرتا اور شلوار، فراخ آنکھیں اور اس پر چشمہ پیری، نکلتا ہوا قد اور اوسط قسم کا بدن، نہ لحیم وشحیم، نہ نحیف ونزار، مسکراتا ہوا چہرہ، ایک ایک لفظ اور ادا سے اپنائیت آشکار، یہ اس حقیر کی حضرت مولانا کاپودرویؒ سے پہلی ملاقات تھی، اس موقع پر کچھ زیادہ گفتگو تو نہیں ہوئی؛ لیکن میں نے ان کو اس حیثیت سے جانا کہ وہ اس ادارہ کے سابق مہتمم اور اس کو شہرت ومقبولیت کے بام عروج پر پہنچانے والی شخصیت ہیں، اور انھوں نے بھی مجھے اس پہلو سے پہچانا کہ میں ''بحث ونظر'' کے مقالہ نگاروں میں سے ہوں، وہ اس رسالہ کو بہت پسند کرتے تھے اور اس کے قاریوں میں تھے، پھر دفتر اہتمام سے گزر کر

اور مدرسہ پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے لائبریری پہنچا، پہلے تو مدرسہ کی چمن بندی اور عمارت کی غیر معمولی سلیقہ مندی نے متأثر کیا، پھر جب وہاں سے لائبریری پہنچا تو وہاں کتابوں کی کثرت سے زیادہ حسن انتخاب نے شاد کام کیا، اس وقت وہاں جمشید پور (سابق بہار اور موجودہ جھارکھنڈ) سے تعلق رکھنے والے علماء کے مزاج شناس اور کتابوں کے سلسلہ میں باذوق نوجوان فاضل، لائبریرین کا فریضہ انجام دے رہے تھے، افسوس کہ ان کے نام کے سلسلہ میں حافظہ بے وفائی کر رہا ہے، میں نے جب ان سے کتابوں کے حُسن انتخاب کی اور لائبریری کی ترتیب وتنسیق کی تعریف کی تو انھوں نے کہا کہ یہ سب حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحبؒ کا فیض ہے۔

اسی وقت مجھ پر مولانا کے علمی ذوق، کتابوں پر نظر اور فکری بصیرت کا ایک نقش قائم ہوگیا، مجھے یاد ہے کہ اس وقت لائبریری میں مشکوٰۃ المصابیح کی احادیث کی تخریج پر ایک بڑی عمدہ کتاب ملی، میں ڈیڑھ دو گھنٹے اس کی ورق گردانی کرتا رہا، یہ کافی قدیم مطبوعہ کتاب تھی، میرے ذمہ اس وقت مشکوٰۃ شریف کا سبق تھا؛ اس لئے طبیعت مچل گئی کہ کسی طرح اس کتاب کا عکس حاصل ہو جائے؛ مگر اس وقت اتنی مالی گنجائش بھی نہیں تھی کہ میں اس کی زیراکس کرا لیتا؛ اس لئے کف افسوس ملتا ہوا واپس آ گیا، اور بھی کئی نادر اور اہم کتابیں نظر آئیں، جو میرے لئے انکشاف کے درجہ میں تھیں، مدارس کے نظماء و مہتمم کو عام طور پر تعمیرات، جلسوں اور ضیافتوں کا تو بڑا ذوق ہوتا ہے؛ لیکن ان کی نظر میں کتب خانوں کی اہمیت سب سے کم ہوتی ہے؛ اس لئے مجھے لائبریرین صاحب کی بات سُن کر دل میں مولانا کی بڑی قدر پیدا ہوئی۔

اس سفر میں مولانا سے پھر کوئی دوسری ملاقات نہیں ہوئی، مولانا یقیناً سیمینار میں تشریف لائے ہوں گے اور اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے ان کو شہ نشین پر بٹھایا گیا ہوگا؛ لیکن قاضی صاحب نے فقہ کا جو کارواں ترتیب دیا تھا، اس میں اُس وقت میری حیثیت گرد کارواں سے زیادہ نہیں تھی؛ اس لئے اگرچہ میں مقالہ لکھتا تھا اور قاضی صاحبؒ کے بہت سے کام انجام دیتا تھا، نیز بحث ومناقشہ میں حصہ بھی لیتا تھا؛ لیکن عموماً پچھلی صفوں میں کہیں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا؛ اس لئے سیمینار کے درمیان ملاقات کی نوبت نہیں آئی، اس کے کافی عرصہ بعد ایک بار ایسا ہوا کہ جامعہ فلاح دارین کی دعوت پر میں وہاں حاضر ہوا، اس وقت وہاں کے فضلاء کی معہد میں آمد شروع ہو چکی تھی؛ اس لئے عام طور پر ادارہ کے اساتذہ کی طرف سے محبت وعنایت حاصل رہتی تھی، ان عنایت فرماؤں میں ایک اہم نام قاری محمد صدیق صاحب صدر شعبۂ قرأت کا تھا، حضرت مولانا سید ذوالفقار صاحبؒ اس وقت باحیات تھے، وہ یوں بھی مجھ پر شفیق تھے، پھر ان کے لائق صاحبزادے عزیز گرامی مولانا محمد جنید فلاحی اسعدہ اللہ تعالیٰ فی الدارین چوں کہ چند ماہ میرے ساتھ حیدرآباد میں رہے اور میرے مشورہ سے یہ وقت مطالعہ وتحقیق میں گزارا؛ اس لئے انھوں نے اپنی محبت اور حُسن ظن کی وجہ سے اپنے والد ماجد سے میرا کچھ اس طور پر ذکر کیا کہ ان کا لطف وکرم دوچند ہوگیا۔

اس آمد کی مناسبت سے عزیزی مولانا محمد ارشد فلاحی سلمہ اللہ تعالیٰ جو اس وقت نائب مہتمم تھے، اور عملاً سارا انتظام دیکھتے تھے، نے مجھے مدعو کیا، اپنے مکان پر پُر تکلف دعوت کی اور بہت سارے لوگوں کو مدعو کیا، حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ اس وقت اپنے وطن میں موجود تھے؛ اس لئے ان کی بھی تشریف آوری ہوئی، مولانا نے اس حقیر کا محاضرہ سنا، اور بہت زیادہ حوصلہ افزائی کے کلمات کہے، اس موقع پر ایک پُر لطف بات پیش آئی کہ جب میں نے دسترخوان کے مختلف قسم کے لوازم موجود پائے اور دال نہیں دیکھی تو بے تکلفی میں پوچھ لیا: کیا آپ نے کچھ دال وال کا انتظام نہیں کیا ہے؟ یہ سنتے ہی مولانا ہنس پڑے، مجھے مولانا کے ہنسنے پر خفت سی محسوس ہوئی اور خیال گزرا کہ شاید میں نے بے موقع بات کہہ دی، مولانا نے فوراً وضاحت کی اور فرمایا: میں آپ کے سوال پر نہیں ہنس رہا؛ بلکہ بات یہ ہے کہ جب میں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو پہلی بار یہاں مدعو کیا تھا تو جیسے آپ کے شاگرد نے آپ کے لئے کھانے کا انتظام کیا ہے، اسی طرح میں نے بھی اہتمام کیا تھا؛ لیکن اس میں دال نہیں تھی، مولانا جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اخیر میں فرمایا: ہمارے یہاں ایک مسکین سی چیز دسترخوان کی زینت ہوتی ہے، کیا آپ کے یہاں اس کا بالکل گزر نہیں ہے؟ میں نے دریافت کیا: حضرت! وہ کیا چیز ہے؟ مولانا نے فرمایا: ہم لوگ اس کو دال کہتے ہیں، میں نے کہا: حضرت! اگلے وقت سے یہ شئی بھی دسترخوان پر موجود رہے گی۔

یہ مولانا سے پہلی ملاقات تھی، جس میں زیادہ قریب سے آپ سے گفتگو اور آپ کی باتیں سننے کا موقع ملا اور پہلی ہی مجلس میں اندازہ ہوگیا کہ مولانا ایک وسیع الفکر، کثیر المطالعہ اور درسگاہی تنگ نظری سے ماوراء شخصیت ہیں، اس کے بعد مختلف ملاقاتیں ہوتی رہیں، کبھی دلی میں، کبھی دارالعلوم وقف دیوبند کی شوریٰ میں اور زیادہ تر گجرات کے مختلف پروگراموں اور کناڈا کے سفر میں، اکیڈمی کا ۱۹ رواں سیمینار ۲۰۱۰ء میں جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ میں منعقد ہوا، حضرت مولانا عبداللہ مظاہری (بانی جامعہ ہذا) سیمینار کے داعی تھے، سیمینار میں ملک بھر سے تو اہل علم کی بڑی تعداد شامل تھی ہی؛ لیکن خاص کر گجرات کے وہ علماء جو اپنے وطن میں کام کر رہے ہیں، اور جو مختلف ملکوں میں دینی خدمت میں مشغول ہیں، بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، ڈاکٹر محی الدین علی قرہ داغی (قطر) اور مختلف عرب اور بیرونی علماء بھی شریک سیمینار تھے، اس موقع پر حسب معمول اس حقیر نے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ پیش کیا، اس خطبہ میں اجتماعی اجتہاد، بوقت ضرورت دوسرے مذاہب سے استفادہ اور تلفیق پر گفتگو کی گئی تھی، انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق بہت سراہا، اور خود بھی تلفیق کے موضوع پر اچھی اور معتدل گفتگو فرمائی، نیز سیمینار کی تمام نشستوں میں اہتمام سے شریک ہوتے رہے، انھوں نے اپنے تاثراتی خطاب میں اکیڈمی کی خدمات کو سراہتے ہوئے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

پھر اکیڈمی کا ۲۳ رواں سیمینار اکیڈمی کے ایک ذمہ دار حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب کی دعوت پر

جامعہ علوم القرآن جمبوسر (گجرات) میں منعقد ہوا، اس سیمینار میں میں نے اپنا کلیدی خطبہ ''اختلاف رائے کے درجات اور آداب'' پر پیش کیا، یوں تو اس خطاب کو تمام ہی اہل علم نے میری توقع سے بہت زیادہ پسند کیا؛ لیکن خاص طور پر حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ اور حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری دامت برکاتہم نے فرمایا کہ اس خطبہ کا گجراتی اور انگریزی زبان میں ضرور ترجمہ ہونا چاہئے؛ بلکہ دوسری زبانوں میں بھی، مولانا کاپودروی کی پوری تقریر اسی خطبہ کی تائید میں ہوئی، اگرچہ مولانا سیمینار کی تمام نشستوں میں شریک نہیں ہو سکے؛ لیکن اکثر نشستوں میں شریک ہوئے، ان مجلسوں میں مولانا کے علمی ذوق اور فکری وسعت کا بھی اندازہ ہوا اور اس علمی وفکری لیاقت کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندی بھی قدم قدم پر دیکھنے کو ملی۔

۲۰۱۱ء میں اسلامک فاؤنڈیشن ٹورنٹو کی دعوت پر میرا کناڈا کا سفر ہوا، اس وقت مولانا مستقل طور پر وہیں مقیم ہو گئے تھے، میرے زیادہ تر خطابات اسلامک فاؤنڈیشن میں ہوئے، ایک دو خطاب مولانا کے خویش مولانا محمد قاسم انگار کی مسجد ''مسجد ابوبکر صدیق'' میں اور کچھ اور جگہوں پر ہوا، مولانا فاؤنڈیشن اور مسجد صدیق کی تمام نشستوں میں بنفس نفیس شریک رہے، ایک دن تشریف نہیں لا سکے، اس دن عشائیہ پر مولانا ہی کے یہاں مدعو تھا، جب پہنچا تو مولانا نے فرمایا: آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے آج آپ کا بیان نہیں سنا، میں نے آپ کا پورا بیان نیٹ پر سنا ہے، مولانا نے اس دن بڑی پُر تکلف دعوت فرمائی، چلتے ہوئے کچھ ہدیے بھی عنایت کئے، اگلے دن تفریح کا نظام بنایا گیا تھا، اس میں بھی شرکت کے خواہش مند ہوئے؛ چنانچہ اگلے دن ہم لوگوں کا قافلہ سب سے پہلے مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا، پھر وہاں سے سائنس میوزیم جانا ہوا، یہ میوزیم واقعی دیکھنے کے لائق ہے، مولانا نے ہنستے ہوئے کہا کہ آج آپ کو ایک فلم دکھاتا ہوں، میں نے عرض کیا: اگر ہندوستان میں لوگوں کو خبر ہو کہ آپ نے فلم دکھائی ہے اور میں نے دیکھی ہے تو لوگوں کے لئے اس کا بہترین جواز ہاتھ آجائے گا، بہر حال یہ فلم سمندر کے اندر کی دنیا سے متعلق تھی، جس کو دیکھ کر واقعی انسان کا ایمان تازہ ہو جائے، اس روز پورے دن ہم لوگ ساتھ ساتھ رہے، اور ساحل سمندر کی بھی سیر کی، بہت سے فکری اور ادبی موضوعات پر مولانا سے مستفید ہونے کا موقع ملا، اس میں آپ نے اپنی بعض آپ بیتیاں بھی سنائیں، جو بڑی دلچسپ تھیں، ویسے بھی مولانا زاہد خشک قسم کے آدمی نہیں تھے؛ چنانچہ خوبصورت اور بامعنیٰ اشعار بھی سنائے، لطائف بھی اور دلچسپ واقعات بھی، اس سفر میں خاص طور پر اس بات کا اندازہ ہوا کہ ان کی فکر میں وسعت اور اعتدال ہے، اور اس معاملہ میں مجھے وہ عام علماء بالخصوص گجرات کے معروف علماء کے مقابلہ بالکل منفرد نظر آئے، میرے لئے کناڈا کے اس سفر کی حصولیابیوں میں مولانا سے قریبی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

دار العلوم وقف دیوبند جب اپنے بحرانی حالات سے باہر نکلا، اس نے ایک نئی کروٹ لی اور حضرت مولانا

محمد سفیان قاسمی زیدت مکارمہم نے ''مجلس مشاورت'' کے نام سے دار العلوم کی شوریٰ بنائی، تو اس میں حضرت مولانا کو تو ان کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے رکن بنانا ہی تھا، اس حقیر کو بھی از راہ محبت اور علاقۂ رفاقت رکن منتخب کیا، ہم دونوں پابندی کے ساتھ ان مجلسوں بھی حاضر ہوتے، اور اکثر تعلیمی امور کے مشورہ میں ہماری اور آپ کی رائے میں پوری موافقت ہوتی، ایک بار منتظمین نے مشاورتی نشست کے موقع سے اجتہاد کے موضوع پر میرا محاضرہ رکھ دیا، اس وقت مولانا کی طبیعت بہتر نہیں تھی، مولانا نے اس نشست میں بیٹھنے کا ارادہ فرمایا، میں نے علالت کی وجہ سے اس ارادہ سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی؛ لیکن مولانا نے باوجود علالت کے میری درخواست قبول نہیں کی، اور مکمل دوڈھائی گھنٹہ بیٹھے رہے، نیز اخیر میں چند کلمات کہہ کر دعاء بھی کرائی۔

۲۰۱۶ء میں ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے قیام کے پندرہ سال مکمل ہونے کی مناسبت سے ''بین الاقوامی سیرت سیمینار'' رکھا گیا اور اس میں سیرت سے متعلق روایتی موضوعات سے ہٹ کر عصر حاضر کے تناظر میں عنوانات مقرر کئے گئے، مولانا کی جان لیوا علالت شروع ہوچکی تھی، اور مرض کا بھی انکشاف ہوگیا تھا، پھر بھی میرے اصرار پر مولانا اپنے فرزند اکبر جناب مولانا محمد اسماعیل پٹیل صاحب کے ساتھ تشریف لائے، میں نے مولانا کے آرام کا خیال کرتے ہوئے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا تھا؛ لیکن مولانا نے معہد کے معمولی قسم کے مہمان خانہ کو ہی قیام کے لئے ترجیح دی، باوجود علالت اور تکلیف کے ——جس کی وجہ سے انھیں اپنی واپسی کو ایک دن مقدم کرنا پڑا —— جب تک رہے، تمام نشستوں میں شریک ہوتے رہے، افتتاحی نشست میں خطاب فرمایا، اور ایک نشست ——جس کا عنوان تھا'' محمد ﷺ کا ذکر، دیگر مذہبی کتابوں میں'' ——صدارت فرمائی، اور بہت پُر مغز اور بصیرت افروز صدارتی خطبہ دیا، نیز اپنے خطبہ میں خاص طور پر علماء کو سنسکرت اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے سیکھنے پر توجہ دلائی، یہ خطاب بھی آپ کے خطابات کے مجموعہ ''صدائے دل'' میں شامل ہے۔

مولانا یوں تو معہد ایک ہی بار تشریف لائے؛ لیکن انھیں اس ادارہ سے بڑا اُنس ہوگیا تھا مختلف لوگوں سے معلوم ہوا کہ محبت کے ساتھ اس ادارہ کا ذکر فرماتے تھے، فضلاء کو یہاں داخلہ لینے کی ترغیب دیتے تھے، گجرات کے جو طلبہ معہد سے پڑھ کر جاتے تھے، ان سے یہاں کے احوال دریافت کرتے تھے، انہوں نے معہد کے لئے اپنے تأثرات بھی بڑی محبت کے ساتھ تحریر فرمائے اور کیوں نہ ہو کہ ان کے ذوق ومزاج اور معہد کے ذوق ومزاج میں گہری ہم آہنگی تھی؛ کیوں کہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمہ فکر ونظر سے آب حیات حاصل کرتے تھے، اور وہ ہے: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی فکر۔

مؤرخہ: ۱۹/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ مطابق ۸/ مارچ ۲۰۱۸ء کو جامعہ اسلامیہ کھروڑ میں حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوریؒ پر سیمینار تھا، اس مناسبت سے راقم الحروف کی بھی حاضری ہوئی، میں دہلی سے بذریعۂ

فلائٹ سورت پہنچا، پہلے سے ارادہ تھا کہ مولانا کی عیادت کے لئے حاضر ہوں گا، اس سے پہلے بھی ایک دو بار کاپودرہ حاضری ہوچکی تھی، ائیر پورٹ پر استقبال کرنے والوں نے بتایا کہ ناشتہ کا انتظام مولانا ہی کے گھر پر ہے، دولت کدہ پر پہنچا،حسب معمول بڑے تپاک اور محبت سے ملے، اس وقت مولانا کی طبیعت بہت خراب تھی، اور کافی تکلیف کی حالت میں تھے؛ اس لئے زیادہ تر لیٹے ہی لیٹے مہمانوں سے مل رہے تھے؛ مگر اس وقت بھی اہل تعلق کا پورا خیال ملحوظ خاطر تھا؛ چنانچہ چند کتابیں بھی عنایت فرمائیں، کچھ اپنی اور کچھ دوسرے اہل علم کی، یہ مولانا کے مجاہدہ کی بات ہے کہ شدت تکلیف کے باوجود اسی حال میں کھروڑ کے سیمینار میں تشریف لائے، اور بڑا عمدہ خطاب فرمایا، اس خطاب میں جہاں حضرت مولانا یونس صاحبؒ کے علمی شغف کا ذکر تھا، وہیں نوجوان فضلاء کے لئے دعوت بھی تھی کہ وہ علم اور کتابوں سے اپنا رشتہ کمزور نہ ہونے دیں، جب میں ان کے یہاں سے کھروڑ جانے لگا تو خاص طور پر میزبانوں سے خواہش کی کہ مجھے کتب خانہ دکھایا جائے؛ چنانچہ میں پہلے کتب خانہ کی عمارت میں گیا، کتب خانہ کی عمارت، کتابوں کا ذخیرہ اور اس کی خوبصورت ترتیب وتنسیق کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا، یہی مولانا سے آخری ملاقات تھی، بیماری کے دوران مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد اسماعیل صاحب سے برابر رابطہ رہتا تھا اور خیر وعافیت معلوم ہوتی رہتی تھی۔

وفات کے بعد گجرات کا پہلا سفر مورخہ:۲۸ر جولائی ۲۰۱۸ء کو لوناواڑہ کا ہوا، پہلے سے دل میں تقاضا تھا کہ مولانا کے در دولت پر حاضر ہوکر اُن کے ورثاء سے ملاقات کی جائے؛ چنانچہ لوناواڑہ سے ڈابھیل جاتے ہوئے تھوڑی دیر کاپودرہ میں توقف کا موقع ملا، مولانا کے صاحبزادگان، بھائی، دوسرے متعلقین اور گاؤں کے معززین موجود تھے، سب کچھ تھا؛ لیکن مولانا نہیں تھے: اس لئے طبیعت میں بے کیفی سی تھی، جس حجرہ میں مولانا آرام کرتے تھے، وہاں بھی گیا، مولانا کے صاحبزادوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنا پورا کتب خانہ دارالعلوم کھروڑ کو دے دیا ہے؛ البتہ صرف یہ چند کتابیں رہ گئی ہیں، ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کو میرے پاس ہی رہنے دو، مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ جن کتابوں کا انھوں نے قریب رکھنے کے لئے انتخاب فرمایا تھا، اس میں میری ''آسان تفسیر قرآن مجید'' کی دونوں جلدیں بھی تھیں۔

یہ تو اس حقیر کی مولانا کے ساتھ آپ بیتی تھی، مولانا کی شخصیت میں، میں نے جو خصوصیات دیکھیں، ان میں دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ایک: فکری وسعت، اور اس کی وجہ سے اعتدال، دوسرے: افراد سازی اور تربیت، فکر ونظر کی وسعت کا ایک مظہر یہ تھا کہ وہ تمام علمی ودینی حلقوں سے تعلق رکھتے تھے، اور سبھوں کے درمیان مقبول ومعروف تھے؛ حالاں کہ گجرات کی تاریخ پر قلم اٹھایا حضرت مولانا عبدالحی حسنیؒ نے، جو ندوہ کے ناظم تھے، اور مولانا ابوظفر ندویؒ نے، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بلند پایہ فاضل اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے پرداختہ اور تربیت یافتہ تھے؛

لیکن گجرات میں عمومی طور پر ندوہ کو پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی؛ بلکہ اس سے ایک طرح کی بے گانگی برتی گئی، غالباً مولانا پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اکابر دیوبند کی طرح اکابر ندوہ سے تعلق استوار کیا، مجھے نہیں معلوم کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ پہلی بار کب گجرات تشریف لائے؛ لیکن میرا خیال ہے کہ علماء گجرات کے درمیان غالباً سب سے پہلے مولانا ہی نے آپ کو متعارف کرایا، اسی مناسبت کا اثر ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے ایک موقع پر گجرات کے علماء سے کہا: ''مولانا عبداللہ صاحب بڑے دُور اندیش ہیں، اے گجراتیو! ان کی قدر کرو''۔ (گلدستۂ محبت: ۳۰۳)

مولانا کو اپنے عہد کے تقاضوں اور ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مطلوبہ صلاحیت کا بخوبی ادراک تھا؛ اس لئے انھوں نے انگریزی زبان کو بھی ''جامعہ فلاح دارین'' کے نصاب میں شامل کیا، اس سلسلہ میں مخالفت بھی کی گئی، اور بعض لوگوں نے اسے تجدد تصور کیا؛ لیکن مولانا دینی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت اپنے موقف پر قائم رہے، اور طلبہ کو انگریزیت سے بچاتے ہوئے انگریزی زبان کی تعلیم دلائی۔

وہ صرف انگریزی زبان کی تعلیم کو ہی کافی نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اس بات کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ علماء کو دعوتی تربیت کے لئے مقامی زبان سے واقف ہونا چاہئے، اسی طرح علماء جہاں جائیں اور خدمت کریں، ان کو وہاں کی مقامی زبان سے بھی واقف ہونا چاہئے، جیسے انگریزی مما لک میں انگریزی، جرمنی میں جرمن اور فرانس میں فرانسیسی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے سیرت سیمینار تشریف لائے تو پروگرام کے عنوانات کی مناسبت سے اس بات پر بہت زور دیا کہ ہمیں مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہئے اور اس کے لئے برادرانِ وطن کی زبان سیکھنی چاہئے۔

جب برطانیہ تشریف لے گئے، تو علماء سے گزارش کی کہ انگریزی زبان اچھی طرح سیکھی جائے؛ تاکہ مقامی لوگوں سے ان کی زبان میں بات کی جاسکے، (صدائے دل: ۲/ ۴۳) وہ عصری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے، اور علماء سے کہتے تھے کہ وہ بہترین انگریزی زبان سیکھیں؛ تاکہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان کام کرسکیں، اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

> بعض مسلمان اسٹوڈینٹ ایسے ہیں کہ اگر ان پر محنت کی جائے تو وہ دین کا بہترین کام کرنے والے بن سکتے ہیں؛ لیکن شرط یہ ہے کہ ان کو کوئی انگریزی (میں دین) سکھائے، اب ہمارے جو علماء یہاں سے فارغ ہوکر جارہے ہیں، وہ انگریزی سے نابلد ہیں، نوجوان نسل جس پر اُمت کا دارومدار ہے، ان کو سمجھانے کے لئے ہم کو ان کی زبان سیکھنا پڑے گا، کم سے کم ہمارے پاس کچھ بچے ایسے ضرور ہوں جو بہترین انگریزی جانتے ہوں، خصوصاً وہ لوگ جن کو باہر کے ملکوں میں کام کرنا ہے کہ جہاں کی اصل زبان انگریزی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو اخیر عمر میں خیال ہوا، جب علامہ اقبالؒ سے ان کا ربط پیدا ہوا اور علامہ اقبال نے کہا کہ نیوٹن نے فلانی چیز شائع کی ہے تو علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے کہا کہ یہ نیوٹن نے اپنی طرف غلط نسبت کی ہے، یہ تو ''عراقی'' نے لکھا ہے تو علامہ اقبال کو یقین نہ آیا کہ جرمنی کا اتنا مشہور سائنس داں کہہ رہا ہے اور آپ فرمارہے ہیں کہ عراقی نے لکھا ہے، تو حضرت نے ایک مسودہ نکالا اور علامہ اقبال کے سامنے رکھ دیا، اور کہا: یہ پڑھ لو، یہ بات چار سو سال پہلے عراقی نے لکھ دی ہے تو علامہ اقبال کو حضرت علامہ انور شاہ سے بہت عقیدت ہوگئی؛ چنانچہ وہ بار بار مجلسوں میں کہتے تھے کہ فقہ کی تشکیل جدید اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ہیں، اس وقت شاہ صاحب کو یہ خیال ہوا کہ میں بھی انگریزی جانتا تو ان کے دلوں میں کسی طرح بات اُتارتا۔ (گلدستۂ محبت: ۳۳۴)

عربی زبان وادب کے لئے ندوہ کے نصاب کو شامل نصاب کیا، جو گجرات کے مزاج کے لحاظ سے ایک نئی چیز تھی، اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہاں طلبہ میں عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہوا؛ چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے فلاح دارین کی انجمن طلبہ کے پروگرام میں طلبہ کی عربی تقریریں سنیں تو فرمایا:

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ندوہ ہی میں اچھی عربی بولی جاتی ہے؛ لیکن یہاں کی عربی تقریریں سن کر محسوس ہوا کہ گجرات میں بھی ندوہ ہے۔ (گلدستۂ محبت: ۳۰۳)

وہ چاہتے تھے کہ طلبہ صرف عربی زبان ہی نہ پڑھیں؛ بلکہ ان میں عربی تلفظ کا بھی اہتمام ہو؛ چنانچہ طلبہ کو تلقین کرتے تھے کہ وہ جس طرح قرآن مجید پڑھنے میں تلفظ کا لحاظ کرتے ہیں، اسی طرح جہاں بھی عربی عبارت پڑھیں، وہاں صحیح تلفظ کا اہتمام کریں، آپ نے طلبہ میں عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے طلبہ کی ایک مستقل انجمن ''مجلس الصحافۃ العربیۃ'' کے نام سے قائم کی، جس میں عربی مجلّات ورسائل جمع کئے جاتے۔

ذاتی صلاحیت اور فطری ذوق کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے تعلق اور دیوبند میں شیخ محمود مصری سے استفادہ کی وجہ سے مولانا کے اندر عربی زبان وادب کا بہت اعلیٰ ذوق تھا، اسی لئے آپ کو عربی زبان میں گفتگو اور خطاب کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی مہارت حاصل تھی، سیدنا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دوسری صلاحیتوں اور اخلاقی بلندیوں کے ساتھ ساتھ زبان وادب کے معاملہ میں بھی آپ کے قدر شناس تھے، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ مجذوب نے آپ کے نام ایک خط لکھا، جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس میں جہاں اور باتوں کا ذکر ہے، وہاں عربی زبان کے سلسلے میں آپ کی مہارت اور صلاحیت کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا

ہے؛ چنانچہ مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''**قد ملأ نفسي إعجاباً بمواهبكم وعربيتكم وانتظام أفكاركم العميقة**'' (علماء ومفکرون عرفتھم، ج:۲) فضلاء فلاح دارین ترکیسر میں عربی زبان وادب کے ذوق کو مزید پروان چڑھانے کے لئے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے معادلہ کرایا، اور یہاں کے فضلاء وہاں جانے لگے، مولانا کی دوررس نظر ہی کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ علماء کو مطالعہ میں وُسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ماحول اور ذرائع ابلاغ پر نظر رکھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، (دیکھئے: گلدستۂ محبت: ۵۰) یہ بات ایسے ماحول میں کہی جارہی ہے، جہاں مدارس میں اخبار کی آمد کو شجرۂ ممنوعہ تصور کیا جاتا تھا، اور احوال زمانہ سے باخبری کو تعلیمی یکسوئی کے لئے سم ّقاتل سمجھا جاتا تھا، عام طور پر مدارس کی سرگرمیاں تعلیم وتعلم تک محدود ہوتی ہیں، اور اخبارات ورسائل کی اشاعت پر توجہ نہیں ہوتی، ماہنامہ یا سہ ماہی تو نکالے جاتے ہیں؛ لیکن باضابطہ اخبار نکالنے کا تصور نہیں، مولانا علماء کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ گجراتی یعنی مادری زبان مین اخبار نکالیں۔ (صدائے دل: ۱۱۷/۴)

مولانا نے اپنے خطاب میں بڑی دردمندی کے ساتھ متوجہ فرمایا ہے کہ علماء کو اخبارات میں چھپنے والی چیزوں پر نظر رکھنی چاہئے:

> آج سے چند سال پہلے ہم آئے تھے اور میں نے جگہ جگہ جا کر اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ ہر ایک مدرسہ میں ایک یا دو عالم تو ایسے مقرر کرو جو یہاں کی صحافت پر گہری نظر رکھیں، دو عالم ایسے طے ہونے چاہئے کہ جو چیز چھپ رہی ہے، وہ اُس کو پڑھ لیا کریں، اور روزانہ اُس جگہ پر نشان لگائیں، جہاں اسلام کے خلاف کوئی بات لکھی ہوئی ہو، میرے بھائیو! اگر ہم حالات سے واقف ہی نہیں ہوں گے تو ہم دفاع کیسے کریں گے؟ یہ تو عقل میں آنے والی بات نہیں، اگر میں کسی چیز سے واقف ہی نہیں ہوں تو میں اُس سے دفاع کیسے کروں گا؟۔ (صدائے دل: ۱۹۶/۳)

وہ ان بافیض علماء میں تھے، جو زمانے کی نبض پر انگلی رکھتے تھے، جب اسکولوں میں سرسوتی وندنا کی بات سامنے آئی تو علماء کو اس کی نزاکت کی طرف متوجہ کیا، مدارس ومکاتب کے ذمہ داران واساتذہ کو توجہ دلائی کہ وہ سرکاری اسکولوں میں جاری نصاب کا مطالعہ کریں اور اس میں اسلام مخالف جو مواد پڑھایا جارہا ہے، ان سے آگاہ رہیں؛ تاکہ اپنے بچوں کو ان سے محفوظ رکھ سکیں۔

مولانا نے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ جدید لٹریچر پر نظر ہونی چاہئے کہ اس میں کہاں دبے پاؤں الحاد آرہا ہے؟ آپ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے حوالہ سے فرماتے تھے:

> ادب کے ذریعہ الحاد پھیل رہا ہے، ناولوں کے ذریعہ دنیا میں الحاد پھیلایا جارہا ہے، لٹریچر

کے ذریعہ الحاد پھیلایا جارہا ہے؛اس لئے ہمیں بھی اُن کتابوں کو دیکھنا چاہئے جو چھپ رہی
ہیں کہ اُن میں وہ کیا چھاپ رہے ہیں؟ ہمارے بچے اسکول میں جو سبق پڑھ رہے ہیں،
وہ کس انداز کے ہیں، اگر ہم اُس کی طرف نظر نہیں کریں گے تو وہ زہر ہمارے گھروں میں
پھیلتا جائے گا، اور بچے ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ (صدائے دل: ۳/ ۲۰۳)

مولانا کی وسیع القلبی اور فراخدلی کی بات ہے کہ آپ نے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ۴۹/ کتابوں کی ایک فہرست بنائی اور ذمہ داران مدارس کو لکھا کہ نوجوان علماء کو ان کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے، ان میں امام حسن البناء، اخوان المسلمین کا تذکرہ، سوانح حکیم عبد الحمید دہلوی، پروفیسر محمود احمد غازی کی تالیفات، شیخ محمد اکرام کی آب کوثر، رودکوثر اور موج کوثر بھی شامل ہے، عام طور پر ہمارے یہاں تاریخ وتذکرہ پر بہت کم مطالعہ کیا جاتا ہے، کیا بھی گیا تو یہ مطالعہ اپنے حلقے سے باہر نہیں جاتا؛ لیکن مولانا کی بنائی ہوئی اس فہرست میں شامل جن ناموں کا اوپر ذکر کیا گیا، یہ وسیع القلبی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

جس طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو سب سے پہلے آپ نے گجرات مدعو کیا، اسی طرح حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا پہلا سفر گجرات بھی غالباً آپ ہی کی دعوت پر ہوا؛ حالاں کہ بعض متشدد حضرات کو اس سے اختلاف تھا؛ مگر جب قاضی صاحبؒ گجرات تشریف لائے تو علماء گجرات پر اس کا بڑا اچھا اثر ہوا، پروفیسر سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو بھی آپ نے فلاح دارین میں مدعو کیا اور ان کا خطاب رکھا، اس کا مقصد ملی خدمات کے سلسلہ میں ان کے وسیع تجربات سے استفادہ کرنا تھا؛ حالاں کہ حامد صاحب کی وضع قطع ہندوستان میں اہل دین کی معروف وضع قطع سے مختلف تھی، اور وہ بے ریش بھی تھے؛ لیکن ''الحکمة ضالة المؤمن'' کے تحت مولانا ہر اس شخص سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے، جس سے کوئی علمی یا عملی نفع حاصل ہوسکے، اس وسیع القلبی کا نتیجہ تھا کہ ملت کے باہمی اختلاف میں ان کا رویہ تشدد سے پرے تھا، اور وہ پورے اعتدال کے ساتھ مسائل پر غور کیا کرتے تھے؛ چنانچہ دیوبند کے قضیہ نامرضیہ کے زمانے میں جب آپ نے حضرت مولانا محمد سالم صاحبؒ کو فلاح دارین کے سالانہ جلسہ میں مدعو کیا تو بعض شدت پسند قدر ناشناس حضرات کو اس پر اعتراض تھا؛ لیکن مولانا اپنی رائے پر ثابت قدم رہے اور کہا :

بھائی! حضرت مولانا محمد سالم صاحب حضرت نانوتویؒ کی اولاد میں سے ہیں، حضرت
نانوتویؒ کا ہمارے اوپر کتنا بڑا احسان ہے، ہم ان کی بھی عزت کریں گے اور ہم مولانا
سید اسعد مدنیؒ اور مولانا ارشد صاحب کی بھی عزت کریں گے؛ کیوں کہ وہ ہمارے
حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اولاد ہیں، ہمیں ان کے اختلاف سے کوئی لینا دینا
نہیں ہے۔ (گلدستۂ محبت: ۳۱۶)

مولانا نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی دینی اصلاح تک محدود نہیں رکھا تھا؛ بلکہ حالات ومصالح پر نظر رکھتے ہوئے ان کو معاشی ترقی کی طرف بھی توجہ دلاتے تھے، خود مولانا کا بیان ہے :

> میں چند سال پہلے احمد آباد گیا تھا، ''گجرات ٹوڈے'' کے دفتر میں گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کوئی میسیج دینا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں، پھر میں نے میسیج دیا تھا، وہ انھوں نے چھاپا کہ مسجد کے میناروں کے ساتھ کارخانوں کی چمنیوں کی بھی ضرورت ہے، اگر ایک بھائی مسجد کے میناروں میں پچھتر لاکھ کا خرچہ کر رہا ہے تو کوئی کارخانہ بنا کر غریبوں کو مزدوری پر بھی رکھ لے۔ (صدائے دل: ۴/ ۱۱۸)

اسی طرح آپ اس بات کو بڑی اہمیت دیتے تھے کہ مسلمانوں میں بلا امتیاز مذہب وملت خدمت خلق کا جذبہ ہونا چاہئے، آپ اسلام کے اس پہلو کو سمجھنے اور روبہ عمل لانے کے لئے سیرت نبوی کے مطالعہ کی خاص طور پر ترغیب دیتے تھے، خصوصاً شیخ مصطفی سباعی کی کتاب ''السیرۃ النبویۃ، دروس وعبر'' کی؛ کیوں کہ اس میں سیرت کے سبق آموز پہلوؤں کو ذکر کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔

وہ علماء کو دعوت دیتے تھے کہ اسلام کو جدید اسلوب اور دلائل کے ساتھ پیش کریں، اور عقل سے ہم آہنگ کر کے لوگوں کے سامنے رکھیں، وہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا تجزیہ نقل کرتے تھے کہ یوروپ سے عیسائی مذہب کی جڑ اس لئے اکھڑ گئی کہ وہ اپنے مذہب کو اُس انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہے، جو انداز عقلیت پسند لوگ سمجھ سکتے تھے، اور بہت سی ایسی تنگیاں پیدا کر دیں کہ نوجوان نسل نے کہا کہ یہ تو ایسا مذہب ہے کہ ہم اس کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ (دیکھئے: صدائے دل: ۲/ ۵۵)

اسی لئے آپ علماء کو تلقین کرتے تھے کہ وہ نئی نسل کے لوگوں میں خطاب کرتے ہوئے ان کی ذہنی ساخت کو پیش نظر رکھیں؛ چنانچہ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

> دوستو! نئے نئے مسائل اور نئے نئے فتنے کھڑے ہوتے ہیں، تو اُن فتنوں کے جواب آپ Scientific (سائنسی) طریقہ سے اِس طرح دیں کہ سامنے والے قبول کرلیں، آپ صرف آیتیں ہی بیان کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ ہمارے والے دیہاتوں کے رہنے والے بڑے بوڑھے جو مسجدوں میں بیٹھے ہیں، اور جو انڈیا سے یا پاکستان سے آئے ہیں، وہ اِس کو پسند کریں؛ لیکن آج کل کے نوجوان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی؛ لیکن اگر آپ کسی چیز کو Scientific (سائنسی) اعتبار سے سمجھائیں گے تو وہ مان لیں گے، مثلاً اگر آپ اُن لوگوں کو کہیں گے کہ Pollution

(گندگی) کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے، آج کل لوگ اس پر بہت زور دیتے ہیں؛ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ائیر پورٹ پر No Smoking کے بورڈ لگے ہوتے ہیں، اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، ایسے موقع پر آپ اُن کو وہ حدیثیں سنائیے، جن میں جناب رسول اللہ ﷺ نے درخت کے نیچے پیشاب، پاخانہ کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ نے لعنت فرمائی اُس شخص پر جو پانی کے کنارہ پر پیشاب کرے، تو بتلائیے یہ Pollution (گندگی) کا مسئلہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ لیکن جب آپ ایسی حدیثیں اُن لوگوں کو سنائیں گے جو امریکہ وغیرہ میں رہتے ہیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ اچھا! آج سے پندرہ سو سال پہلے ایسے کہا گیا ہے۔ (صدائے دل: ۱۳۹/۳)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کو بھی ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنے سلف صالحین سے مربوط رہیں، اور فکر ونظر کی اسی شاہ راہ پر رواں دواں ہوں جو بزرگوں نے متعین کی ہے؛ چنانچہ مولانا کے خطاب کا یہ اقتباس سرمۂ چشم بنانے کے لائق ہے :

یاد رکھئے! کہ جو امت اپنے اسلاف سے کٹ جاتی ہے، اُن کی تاریخ سے کٹ جاتی ہے، اُن کی تعلیمات سے روگردانی کرتی ہے، تو دنیا میں اُس کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں رہتا ہے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ اُمتیں اپنے ماضی کے ساتھ جڑی رہنے سے زندہ رہتی ہیں، دنیا میں اُس کا وجود اور اُس کا تشخص برباد ہوجائے گا، ہم اپنی زبان کو، اپنی تہذیب کو، اور اپنے طریقۂ فکر کو اُس انداز پر رکھیں گے جیسے ہمارے بزرگوں نے رکھا ہے، تب تو ہمارا تشخص یہاں باقی رہے گا، اور ہم ذرا سا بھی ادھر اُدھر ہوگئے تو قوم برباد ہوجائے گی، اور اُس کی بہت بڑی ذمہ داری علماء پر ہے۔ (صدائے دل: ۵۱/۲-۵۲)

مولانا کی زندگی میں دوسری اہم خصوصیت ہے: تربیت اور افراد سازی، وہ طالبان علوم نبوت اور فارغین مدارس کو اپنی غذا سمجھتے تھے، اور جب اس قسم کا کوئی مجمع مل جاتا تو ان کا سوز دروں انگڑائی لینے لگتا تھا، اسی تربیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ اردو زبان کی تصحیح پر بہت زور دیتے تھے، خط کی اصلاح پر بار بار توجہ دلاتے تھے، اور خارجی مطالعہ کی تاکید کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ اردو شعر فہمی پر بھی متوجہ کرتے تھے؛ چنانچہ اپنے خطاب میں علماء کی بعض کمزوریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

میرے دوستو! ہمارا اپنا مطالعہ بہت کمزور ہے، ہماری اپنی زبان درست نہیں ہے تو ہمارے طلبا کی زبان کیسے درست ہوگی؟ مدرسہ میں پڑھانے والے استاذ جب کبھی

تقریر کرتے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بھائی یہ استاذ ہے اور اس کو اردو زبان میں مذکر ومؤنث کا پتہ نہیں چل رہا ہے؟ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لفظ اُردو میں مذکر ہے یا مؤنث؛ چوں کہ ہمیں اردو زبان سے مناسبت نہیں ہے اور مناسبت اس لئے نہیں ہے کہ ہم اردو کتابیں نہیں پڑھ رہے ہیں، ہمارا مطالعہ ہی نہیں ہے، ہمیں جو کتابیں مدرسہ میں دی گئی ہیں، ان کا حاشیہ، اور جو مشہور شرح ہے اس کو دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ بھائی ٹھیک ہے، ہم پڑھا دیں گے، اپنا فریضہ گویا پورا ہو گیا؛ حالاں کہ یہ بات ٹھیک نہیں، ہمیں اوپر کی کتابیں نیچے کی کتابوں کے لئے دیکھنی چاہئے؛ تاکہ ہم صحیح رہنمائی کریں، موجودہ دور میں جو رسائل نکلتے ہیں، جو نئی نئی کتابیں چھپتی ہیں، ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ (صدائے دل: ۴/۴۱-۴۲)

مولانا علماء کی قوت مطالعہ کو بڑھانے کے لئے انھیں باضابطہ طور پر کتابوں کی رہنمائی بھی فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ جب تک مطالعہ پر مواظبت نہ رہے، علم میں گہرائی و گیرائی پیدا نہیں ہوتی، مدارس چوں کہ علم کا سرچشمہ اور افراد سازی کا سب سے بڑا کارخانہ ہیں؛ اس لئے وہ اساتذہ کو افراد سازی پر خوب توجہ دلاتے تھے، اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں :

میرے دوستو! طلبہ یوں نہیں بنا کرتے، طلبہ بنتے ہیں اساتذہ کی پوری توجہ سے، اساتذہ اگر دل لگا کر طالب علم کے پیچھے پڑ جائیں اور ہر جماعت میں اگر ۲۵ یا ۳۰/ طالب علم ہیں تو ہر ایک کا جائزہ لیں کہ اس کی ذہنی سطح کیسی ہے؟ اس کے حالات کیسے ہیں، یہ کس علاقہ کا ہے، گھر کی پوزیشن کیا ہے؟ اور یہ طالب علم پیچھے کیوں رہ رہا ہے؟ اس کے بات کیوں سمجھ میں نہیں آرہی ہے؟ کس پہلو میں میں کمزور ہے؟ اور اس کے پیچھے وہ مسلسل محنت کرتے رہیں، اس کے بارے میں مشورہ کریں، دعائیں کریں تو تجربہ ہمارا بتاتا ہے کہ طالب علم پھر بن جاتا ہے۔ (صدائے دل: ۴/۳۶)

عام طور پر ارباب مدارس طلبہ کی بدشوقی اور بے صلاحیتی کا ذکر کرتے ہیں؛ لیکن مولانا کو اس عذر لنگ سے اتفاق نہیں تھا، وہ کہتے ہیں :

ہمیشہ جب استاذ کسی طالب علم کے پیچھے اس طرح محبت وشفقت سے اور اپنے خونِ جگر کو پگھلا کر محنت کرتا ہے تو طالب علم ضرور بنتا ہے، یہ بات غلط ہے کہ طلبہ غلط آرہے ہیں، اچھی صلاحیت کے طلبہ اب بھی ہمارے مدارس میں ہیں، ان کی صلاحیتوں کو

اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے، انھیں حکمت عملی کے ساتھ مہمیز لگانے کی فکر کرنی ہے؛
اس لئے ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ (صدائے دل: ۴/ ۴۰)

مدارس کے ذمہ داروں اور اساتذہ کو کبھی کبھی طلبہ کو تفریحی مقامات پر لے جانے کی بھی تلقین کرتے تھے؛ تا کہ وہاں ان کی تفریح بھی ہو، تعلیم بھی ہو، جماعت کے ساتھ نماز بھی ہو، انھیں کھیلنے کا بھی موقع دیا جائے اور انھیں ان کے مقصد سے روشناس بھی کرایا جائے۔ (دیکھئے: صدائے دل: ۲/ ۷)

تعلیم کے علاوہ ایک قابل توجہ چیز ہماری تقریر و بیان کا انداز ہے، ہر عالم دین کو کم وبیش تقریر و بیان کا فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے، آپ نے علماء سے خطاب کرتے ہوئے خاص طور پر یہ بات کہی کہ ہمیں خطاب میں مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کرنا چاہئے :

> اگر آپ لندن شہر کی کسی یونیورسٹی میں تقریر کر رہے ہیں، Educated (پڑھا لکھا) طبقہ آپ کا مخاطب ہے تو آپ کو اُن کی نفسیات کا لحاظ کر کے گفتگو کرنا پڑے گی، وہاں زیادہ تطویل کے ساتھ بولنے کی ضرورت نہیں، ابھی ایک وکیل صاحب مجھے کہہ رہے تھے، عجیب بات ہے جب علماء تقریر کے لئے بیٹھتے ہیں تو وہ ایک ہی چیز کو سمجھانے کے لئے ایک ہی طرح کے جملے دس منٹ تک بولتے رہتے ہیں، ہم تو وکیل لوگ ہیں، ایک ہی مرتبہ میں بات سمجھ جاتے ہیں، پھر اتنی لمبی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آسمان پیدا فرمایا، پھر اُس میں سورج بنایا، پھر اُس میں چاند بنایا اور اُس میں ستارے بنائے، اِس طرح وہ بہت ساری مخلوق شمار کراتے ہیں، بس آپ جو کہنا چاہتے ہیں، وہ کہہ دو، اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اتنی تفصیل کو پسند نہیں کرتے۔ (صدائے دل: ۳/ ۱۳۸)

افسوس کہ آج کل لوگوں کی ضرورت کے بجائے لوگوں کی پسند کے مطابق خطاب اور وعظ و بیان کیا جاتا ہے، مولانا اس کے بہت خلاف تھے؛ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں :

> واعظ وہ نہیں ہوتا ہے جو قوم کے مزاج کو دیکھے کہ یہاں فلانے قصے بیان کریں گے، اشعار پڑھیں گے تو لوگ بہت خوش ہوں گے کہ ماشاء اللہ مولانا نے بڑی زبردست تقریر کی، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ قوموں کے جو امراض ہیں، ان پر انگلی رکھو کہ ہم غلط راستہ پر جارہے ہیں، اسلام کی طرف ہمیں واپس آنا ہے، صحابۂ کرامؓ کی سیرت کی طرف واپس آنا ہے۔ (گلدستۂ محبت: ۳۴۹)

تربیت اور افراد سازی کے اسی جذبہ کے تحت مولانا نے نومبر ۲۰۰۸ء میں مجلس تعلیمی گجرات کے واسطہ سے منتخب اہل علم کو اپنے قصبہ ''کاپودرہ'' مدعو کیا، اور اس میں اسی موضوع پر بہت تفصیلی خطاب فرمایا جو صدائے دل کی چوتھی جلد میں شامل ہے، اسی طرح ۲۲/نومبر ۲۰۱۶ء اور یکم دسمبر ۲۰۱۶ء کو جامعہ قاسمیہ کھروڑ میں آپ کا خطاب ہوا، ان تمام خطابات میں آپ نے خاص طور پر علماء کو اپنا مخاطب بنایا ہے، اور ہر جگہ لوگوں کو اپنا درد دل سنانے اور حالات کو سمجھانے کی فکر کی ہے، ان خطابات کے ایک ایک لفظ سے آپ کی فکر اور امت کے لئے آپ کی بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا نے فلاح دارین ترکیسر کو ایک روایتی انداز کے مدرسہ تک محدود نہیں رکھا؛ بلکہ افراد سازی اور مردم گری کا ایک مرکز بنا دیا، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو آگے بڑھایا، اچھے اساتذہ تیار کئے، ملک بھر میں جہاں کوئی جوہر قابل ملا، اسے حاصل کیا اور اپنی علمی کہکشاں کو آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک اہم مسئلہ نو فارغ فضلاء کے وقت سے پہلے بزرگی اور مشیخیت میں مبتلا ہو جانے کا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی نوجوان فارغ ہو کر جاتا ہے تو اول دن سے مدرسہ کی اصلاح شروع کر دیتا ہے، انتظامیہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے، اور اس کی صلاحیت ضائع اور بے فیض ہو جاتی ہے، مولانا نے اس سلسلہ میں بڑی عمدہ اور وسیع تجربہ پر مبنی نصیحت کی ہے :

> کسی بھی مدرسہ اور دارالعلوم میں خدمت کا موقع ملے تو وہاں کے ماحول میں اولاً مدغم ہو جانا، پھر تدریجاً اصلاح کرنا، فوراً جاتے ہی یہ مت کہنا کہ ہمارے فلاحِ دارین میں یوں ہے، اور یوں ہے؛ ورنہ بجائے اصلاح کے افساد ہو جائے گا۔ (گلدستۂ محبت: ۴۸۴)

مولانا کو من جانب اللہ بہت نفیس علمی ذوق ملا تھا، وہ عربی زبان وادب کے تو رمز شناس تھے ہی، اور ان کے قلم کی پختگی عرب علماء کو بھی متاثر کرتی تھی؛ لیکن دوسرے علوم وفنون سے بھی بڑی مناسبت تھی، مطالعہ کے ذوق کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ذہن بھی بہت اخّاذ عطاء فرمایا تھا، وہ صرف تیراک نہ تھے، غواص تھے اور اپنے تلامذہ اور متعلقین کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے؛ چنانچہ اہل علم کو تاکید کرتے تھے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کو سمجھنے کے لئے عربی مراجع سے رجوع کرنا چاہئے، صرف اُردو ترجمہ پر اکتفاء نہیں کرنا چاہئے، فرماتے ہیں :

> اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مفردات امام راغبؒ یا دوسری ایسی کتابیں تفسیر پڑھنے والے کو بار بار دیکھنی چاہئے کہ اِس لفظ کا کیا معنی ہے؟ قرآن شریف کن حقائق کو بیان کر رہا ہے، جب تک ہم اور آپ اِن کتابوں کو نہیں دیکھیں گے الفاظ کی خوبیاں ہمارے اور آپ کے ذہن میں نہیں آئیں گی، میرا اپنا تجربہ ہے کہ صرف اردو ترجمہ دیکھ کر ہم

قرآن مجید کے الفاظ کی خوبیاں کبھی نہیں سمجھ سکتے، ہم نے دیکھا کہ بہت سے جگہ اردو تراجم میں (لا يظلمون فتيلا) کا ترجمہ ہے،'' وہ نہیں ظلم کئے جائیں گے ذرا برابر'' قرآن مجید میں کہیں (نقيرا) کا لفظ آیا ہے، کہیں (فتيلا) کا، کہیں (قطمير) کا لفظ آیا ہے، کہیں (ذرّة) کا، مثلا (فمن يعمل مثقال ذرّة خيرا يّره ومن يعمل مثقال ذرّة شرّا يره)۔

تو قرآن شریف میں شئے خفیف (معمولی چیز) کے لئے چار لفظ استعمال ہوئے ہیں، قرآن مجید کے تراجم میں نے اُٹھا کر دیکھے، حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ، حضرت تھانویؒ کا ترجمہ، مولانا سعید صاحبؒ کا ترجمہ، مولانا فتح محمد صاحبؒ کا ترجمہ، سب میں ان چاروں جگہ صرف ذرہ ہی کا ترجمہ کیا ہے، اب اگر ہم صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کریں گے تو ان الفاظ کی خوبی اور باہمی فرق کیسے سمجھ سکیں گے؛ لیکن آپ تفسیر ابن کثیر کو دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فتیلا کیا ہے، نقیرا کیا ہے، قطمیر کیا ہے؟ ان تینوں کا تعلق کھجور کے ساتھ ہے، کھجور کو آپ کھولیں گے تو ایک باریک سی جھلی اور پردہ اندر سے نکلے گا اور پھر اس کے اندر گٹھلی کے اوپر ایک دھاگہ ہوگا اور اس میں ایک نقطہ ہوگا تو ان میں سے ایک فتیلا ہے، ایک قطمیر ہے اور ایک نقیر، جب میں نے تفسیر ابن کثیر دیکھی تو میں نے کہا: یااللہ! کیسا تیرا کلام ہے۔ (صدائے دل: ۳/ ۱۳۳-۱۳۴)

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علم کے پیاسے کی پیاس کبھی نہیں بجھتی ہے، مولانا پر یہ رنگ غالب تھا، وہ آخر عمر تک خود بھی بکثرت کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، اور لوگوں کو مطالعہ کی طرف متوجہ بھی کرتے تھے، عام طور پر جو لوگ مغربی ملکوں کی طرف سفر کرتے ہیں، علم وتحقیق سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اور مادی دنیا کی سحر طرازیاں اُن کے دل ودماغ کو فتح کر لیتی ہیں؛ لیکن مولانا کا دل مغرب کے بُت کدہ میں جا کر بھی کعبۂ علم وتحقیق سے ناآشنا نہ ہوا؛ چنانچہ کناڈا سے اپنے معتمد شاگرد مولانا اقبال احمد ٹنکاروی اور اُن کے رفقاء کو خط لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

بعد سلام مسنون! اُمید ہے کہ آپ سب بعافیت ہوں گے، بندہ محمد یوسف نجرامی کی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، اس کتاب کا نام ''العلاقة السياسية والثقافية بين الهند والخلافة العباسية'' ہے، دارالفکر، بیروت لبنان سے طبع ہوئی ہے، اچھی دلچسپ کتاب ہے، صفحہ: ۱۷۱ پر ''النشاط الثقافي في بغداد'' کے عنوان کے ماتحت یہ بات معلوم ہوئی کہ گندھار ضلع بھروچ کی لڑکیاں دارالخلافۃ

بغداد تک پہنچتی تھیں، جن میں بچوں کی تربیت کرنے والیاں بھی ہوتی تھیں، اور گانے والیاں بھی، ان میں خمار ہندیہ بہت ہی مشہور گانے والی تھی، جو گندھار کی باشندہ تھی، اور اس کو خدیجہ بنت ہارون بن عبداللہ الربیع کے دادا نے دو لاکھ درہم میں خریدا تھا، اصل عبارت یہ ہے :

وخلال دراستنا للعصر العباسي نجد النشاط الثقافي للهنود بارزا في بغداد ، وقدمت إلى بغداد كثير من النساء الهنديات من السند وغجرات بجنوب الهند ، وعشن في بلاط الخلفاء ، وامتلئت بهن الأسواق والندوات ، ودخلن بيوت العرب كسيدات ومربّيات الأطفال ومطربات ، الخ ـ

چوں کہ ایک تاریخی معلومات ہے؛ اس لئے تحریر کردی، جس سے بھروچ اور بغداد کے وسیع تعلقات کا پتہ چلتا ہے،''وامتلئت بهن الأسواق والندوات'' بتلاتا ہے کہ کثیر تعداد میں یہاں کی عورتیں بغداد جاتی تھیں اور اس طرح دارالخلافہ اور بھروچ کا مضبوط تعلق قائم ہوا، کاش کہ کوئی باہمت شخص گجرات کی قدیم تاریخی کتابوں سے اس موضوع پر مواد جمع کرے، کیا گجرات کے کسی مؤرخ نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے؟ اس کے لئے گجرات کے تاریخ دانوں سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے، بھروچ شہر میں کوئی قدیم تاریخ ہے، جو بھروچہ ہال میں تھی، تحقیق فرمائیں۔ (گلدستہ محبت: ۱۴۱-۱۴۲)

مولانا اقبال صاحب ہی کے ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں :

اس عریضہ کے ساتھ رزین بن معاویہ العبدریؒ کے بارے میں کچھ معلومات ارسال کرتا ہوں؛ اس لئے کہ صاحب مشکوٰۃ شریف نے بعض روایتوں کو ان سے نقل فرمایا ہے، اور رواہ رزین کہہ کر خاموش ہو گئے ہیں، بندہ نے جس سال مشکوٰۃ شریف پڑھائی تھی، اس وقت ان کے بارے میں جستجو کی تھی، مگر تفصیلات نہ مل سکی تھیں، سوائے نام کے، اس کو حاشیہ پر نقل کر دیا تھا، ھو رزین بن معاویۃ العبدری؛ مگر ابھی علامہ شوکانیؒ کی ''الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة'' کا مطالعہ کر رہا تھا، جس پر عبدالرحمٰن بن يحيىٰ المعلمی اليمانی کی تعلیقات ہیں اور الازہر کے کلیۃ الشریعۃ کے استاذ عبدالوہاب عبداللطیفؒ نے اس کی تصحیح کی نگرانی فرمائی ہے تو رزین کے بارے میں کچھ نئی باتیں سامنے آئیں، وہ مشکوٰۃ شریف کے اساتذہ کے کام کی ہیں،

منقولہ عبارت سے بندہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ: رزین بن معاویہ العبدری کی کنیت ابوالحسن تھی اور وہ مالکی المذہب تھے، مکہ معظّمہ میں سکونت رکھتے تھے، ان کا زمانہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کا ہے، انھوں نے صحاح ستہ کو ایک کتاب میں جمع کرنے کی سعی فرمائی، اور اس میں اور روایتیں بھی داخل فرمائی ہیں، وہ ناقل حدیث تھے، ناقد حدیث نہیں تھے، ان کی سند بھی نازل تھی، فیروزآبادیؒ نے ان کے بارے میں جو تبصرہ فرمایا ہے، اس کے بعد ان سے جو روایتیں نقل ہوئی ہیں، اس کو علماء محدثین کے اُصول کے مطابق جانچ پرکھ کر ہی قبول کرنا چاہیئے۔ (گلدستۂ محبت: ۱۴۶-۱۴۸)

اسی علمی ذوق کا اثر تھا کہ وہ کتابوں کے عاشق تھے، جہاں کوئی اچھی کتاب مل جاتی اُسے خرید لیتے، اور صرف خود لینے پر اکتفاء نہیں کرتے؛ بلکہ اپنے تلامذہ اور احباب کو بھی اُس کتاب کی طرف متوجہ فرماتے، ایک موقع پر جب آپ نے علماء کا تربیتی اجتماع رکھا تو باب الداخلہ پر بہت سی کتابیں بھی رکھیں، جو زیادہ تر نو طبع شدہ تھیں؛ تاکہ آنے والے حضرات ان کتابوں کو دیکھیں، اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ ان کتابوں کو خریدنے کی کوشش کریں، دوران سفر کہیں کوئی مفید کتاب نظر آجاتی یا کسی اہم کتاب پر رسائل میں تبصرہ آتا تو بعض دفعہ مدارس کے ذمہ داروں کو خط لکھتے کہ وہ اس کتاب کو حاصل کریں، بعض کتابیں جن کو مفید خیال کرتے، خرید کر لوگوں میں تقسیم کرتے، کوئی مفید مضمون کسی رسالہ میں نظر آجاتا اور مفید نظر آتا تو اس کی فوٹو کاپی تقسیم کراتے، مجھے بھی سفر کناڈا کے درمیان بعض قلمی رسائل کی زیراکس اور بعض مضامین کی فوٹو کاپی عنایت فرمائی۔

چنانچہ انھوں نے فلاح دارین کے کتب خانہ کو تو بڑھایا ہی؛ لیکن ساتھ ساتھ خود آپ کا ذاتی کتب خانہ بھی اچھا خاصا تھا، اور زیادہ تر اہم اور منتخب کتابیں تھیں، انہوں نے اپنا یہ کتب خانہ جامعہ قاسمیہ کھروڑ کو عنایت فرمایا، اللہ تعالیٰ جامعہ کے ذمہ داروں کو خاص کر حضرت مولانا محمد حنیف صاحب لوہاروی کو خوب خوب اجر عطا فرمائے کہ انھوں نے مولانا کے نام سے کتب خانہ اور اکیڈمی بنادی ہے، اور بہت ہی خوش سلیقگی اور حُسن ترتیب سے کتابوں کو جمایا ہے، مولانا کو کتب خانہ سے اس قدر تعلق خاطر تھا کہ جب اس حقیر کی آخری ملاقات ہوئی تو باوجود بے چینی اور شدت تکلیف کے خاص طور پر مجھ سے تاکید کی کہ کتب خانہ ضرور دیکھئے گا، اور مجھ سے اپنا تأثر بتایئے گا، یہ فطری بات ہے کہ آدمی کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے، وہ اس کو دیکھ کر اور دِکھا کر خوش ہوتا ہے، دولت والا اپنی دولت کی نمائش کرتا ہے، تاجر اپنے سامان تجارت کی اور معمار اپنی تعمیری مہارت کی، اسی طرح علم سے شغف رکھنے والوں کو ذخیرۂ علم کو دِکھا کر خوشی ہوتی ہے۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے زبان وقلم دونوں میدانوں کا شہسوار بنایا تھا، اُن کے خطاب میں جوش وترنگ، نغمہ سرائی اور لطیفہ گوئی نہیں ہوتی تھی، جو عام طور پر عوام کو لبھانے کے لئے پیشہ ور واعظین میں ہوا کرتی ہے، وہ کہیں

دماغ سے اور کہیں دل سے خطاب کرتے تھے، فکر انگیز مضامین اور سوز میں ڈوبا ہوا لب ولہجہ، صاف اور واضح تعبیر اور تکلفات سے محفوظ کلام آپ کے مواعظ کی خصوصیت تھی، ''صدائے دل'' کے نام سے آپ کے مواعظ کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں، وہ اس کی بہترین مثال ہیں، پڑھنے والا جب کوئی مضمون شروع کرتا ہے تو ختم کئے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوتی، اور پورا وعظ شروع سے آخر تک پیغام ہی پیغام ہوتا ہے، نہ کہ تقریر برائے تقریر۔

اگرچہ کہ انتظامی مشاغل اور اخیر دور میں اسفار اور بیرون ملک قیام کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ کا موقع نہ مل سکا؛ لیکن جو کچھ لکھتے، پوری تحقیق اور گہرے مطالعہ کے بعد لکھتے، زبان بھی بہت ہی صاف ستھری، سلیس اور رواں، قافیہ بندی اور مشکل الفاظ سے محفوظ، ترجمہ میں ادبی چاشنی اور زبان کی روانی کو باقی رکھنا دشوار ہوتا ہے؛ لیکن آپ نے ترجمہ میں بھی اس کو باقی رکھا ہے، کثرت مشاغل کے باوجود آپ نے اچھا خاصا تصنیفی سرمایہ چھوڑا ہے، ''أضواء علی تاریخ الحرکۃ العلمیۃ والمعاھد الاسلامیہ في غجرات'' آپ کی اہم عربی تالیف ہے، جس کی علماء عرب نے بھی داد دی ہے، تذکرہ نویسی کا اللہ نے آپ کو خاص ذوق عطا فرمایا تھا؛ چنانچہ آپ نے ''حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے نامور خلفاء، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور ان کی خدمات حدیث، علامہ قطب الدین نہروانی اور ان کے علمی کارناموں'' پر بڑی عمدگی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے، علامہ حارث محاسبی کی رسالۃ المسترشدین کا ترجمہ حضرت مولانا قمر الزماں اِلٰہ آبادی نے فرمایا ہے، اس پر آپ کے مفید حواشی ہیں، اسی طرح آپ نے شیخ صالح یوسف معتوق کی کتاب ''بدر الدین العینی اثرہ في علم الحدیث'' کو بھی ''علامہ عینی اور علم حدیث میں اُن کا نقشِ دوام'' کے نام سے اُردو کا پیکر عطا کیا ہے، دو جلدوں میں آپ کے مقالات کا مجموعہ ''افکار پریشاں'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، جن بزرگوں سے آپ نے علمی وروحانی فیض اُٹھایا ہے، ان کے حالات پر آپ کی کتاب ''رشد وہدایت کے مینار'' قابل مطالعہ ہے۔

آپ نے عصری تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان بچوں کے احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے، مسلمان سائنس دانوں پر مشتمل ایک کتاب کا گجراتی میں ترجمہ کرایا، بزرگوں کی روایت کے مطابق چالیس حدیثوں کا ایک مجموعہ عربی، انگریزی، اور گجراتی میں مرتب کیا، آپ نے سیکڑوں کتابوں پر تقریظ اور پیش لفظ لکھے ہیں، جس کا مقصد اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی، خوشی کی بات ہے کہ ان تحریروں کو ''مقدمات کا پودروی'' کے نام سے جمع کردیا گیا ہے، غالباً آپ کا سب سے نمایاں کام ''دیوان امام شافعیؒ'' کا ترجمہ ہے، مولانا نے صرف اس کا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے؛ بلکہ اس کتاب کے مختلف نسخے حاصل کئے، جو نسخہ انہیں زیادہ مستند محسوس ہوا، اس کو اصل بناتے ہوئے بعض دیگر نسخوں کے اشعار کو بھی شامل کرتے ہوئے ترجمہ کیا، مولانا کا یہ ترجمہ بہت ہی سلیس اور رواں ہے، کہیں بھی ترجمہ پن کا احساس نہیں ہوتا، اشعار میں آنے والے ''مفردات'' کو بھی حاشیہ میں حل کیا گیا ہے، اور جہاں ضرورت دامن گیر ہوئی، وہاں اشعار کی مختصر تشریح بھی کی گئی ہے، یہ دیوان ترجمہ وتعلیق کے ساتھ ۲۵۶ رصفحات پر ہے، جس کا

نیا ایڈیشن ''مجلس معارف کاپودرہ نے'' شائع کیا ہے، کتاب پر حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی اور حضرت مولانا مفتی احمد دیولوی کی تقریظات بھی ہیں، یہ کتاب اس لائق ہے کہ مدارس میں طلبہ کو پڑھ کر سنائی جائے۔

مولانا ۱۹۳۳ء مطابق ۱۳۵۲ھ برما میں پیدا ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد مقیم تھے، ۱۹۴۴ء میں مولانا نے گجرات کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں داخلہ لیا، اور ۱۹۴۸ء میں دیوبند تشریف لے گئے، اور وہاں کنز وشرح جامی کی جماعت میں داخلہ ہوا؛ لیکن آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے آئندہ سال پھر ڈابھیل واپس آ گئے، اور ۱۹۵۳ء میں یہیں سے فارغ ہوئے، بخاری حضرت مولانا عبدالجبار صاحبؒ سے پڑھی، ۱۹۶۹ء — ۱۹۶۰ء میں دوبارہ دیوبند تشریف لے گئے اور حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ اور حضرت مولانا فخر الحسنؒ وغیرہ سے اسباق کی سماعت کی، اسی زمانہ میں دیوبند میں شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری طنطاوی جامعہ ازہر کے مبعوث کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے، اُن سے عربی زبان اور نحو کی بعض کتابیں پڑھیں، اور جدید عربی اسالیب کے سلسلہ میں کسبِ فیض کیا، وہ اپنے اساتذہ کے محبوب بن کر رہے، مختلف مشائخ سے باطنی فیض اُٹھایا، اور متعدد مشائخ نے احسان وسلوک کی راہ میں خلافت عطا کی؛ لیکن مولانا کی شخصیت، ان کی فکر، تقریر وتحریر کا انداز، نظم ونسق کا ذوق، فکر کی بلندی، وسیع المشربی اور بے تعصبی کا اصل سرچشمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات والا صفات تھی، آپ کی تحریر وتقریر اور فکر ونظر میں واضح طور پر فکر ابوالحسن کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۹۵۴ء میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مدرس ہوئے اور جنوری ۱۹۶۶ء میں دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر میں تدریس کی ذمہ داری متعلق ہوئی، پھر اسی سال مارچ میں مہتمم بنائے گئے، اور ۱۹۸۵ء تک اس خدمت پر مامور رہے، پھر اہتمام سے الگ ہو گئے، اور ۱۹۸۹ء تک فلاح دارین کے سرپرست کے منصب پر فائز رہے۔

آخر عمر میں کناڈا منتقل ہو گئے، جہاں اُن کے کئی اعزہ مقیم تھے، وہ وہاں مقیم علماء کے لئے مشعل راہ کا درجہ رکھتے تھے؛ لیکن ظاہر ہے کہ نہ وہاں درس قرآن وحدیث کی بزمیں آراستہ ہوتی تھیں اور نہ علم وتحقیق کی محفلیں سجائی جاسکتی تھیں، نہ ایسے اصحاب طلب میسر تھے کہ جن کو تراش کر وہ فکر ونظر اور زبان وادب کا دُرّ تابدار بناتے، بالآخر ۲۵ رشوال ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۰ رجولائی ۲۰۱۸ء کو اپنی تکلیف دہ علالت پر صبر وسکون کے ساتھ جان، جان آفریں کے حوالہ کر دی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ، افسوس کہ مولانا کے علمی مقام، قائدانہ صلاحیت، مردم گری کے جوہر، تالیف وتحقیق کا ذوق اور نظم ونسق کی اعلیٰ صلاحیت کے لحاظ سے اُن کی قدر نہیں کی گئی اور جو گراں قدر فائدہ اُن کے ذریعہ علماء وعامۃ المسلمین کو پہنچ سکتا تھا، اس کا پورا پورا موقع فراہم نہیں ہوسکا۔

• • •

علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''الغزالی'' کا تنقیدی مطالعہ (۲)

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

تصنیف کے زمانہ کا تعین

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

> منخول کی نسبت فیصلہ نہیں ہوتا کہ کس زمانے کی تصنیف ہے، مکاتبات امام غزالی اور طبقات الشافعیہ تاج الدین سبکی میں لکھا ہے کہ شباب کی تصنیف ہے، جب کہ امام الحرمین زندہ تھے؛ لیکن امام غزالی نے خود اپنی کتاب مستصفیٰ فی اُصول الفقہ میں لکھا ہے کہ ''منخول'' احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور جواہر القرآن کے بعد کی تصنیف ہے، منخول اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کا طرز تحریر علانیہ شہادت دیتا ہے کہ وہ ابتدائی زمانے کی تصنیف ہے، خصوصاً امام ابوحنیفہ کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں، وہ ہرگز اس زمانے کی نہیں ہوسکتی، جب وہ تارک الدنیا اور صوفی ہوچکے تھے اور اس قسم کی طرز تحریر سے توبہ کر چکے تھے۔ (الغزالی، ص:30)

صرف مکاتبات امام غزالی اور طبقات الشافعیہ ہی کی بات نہیں؛ بلکہ سوائے مرتضیٰ زبیدی کے سبھی نے یہی لکھا ہے کہ منخول ان کی ابتدائی اور شباب کی تصنیف ہے، اس معاملہ میں صرف مرتضیٰ زبیدی نے ہی اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے :

> قال ابن السبکی : الفه فی حیاة استاذه امام الحرمین ، قلت : والذی یقتضی سیاق عبارة المستصفی فی اوله انه متاخر عن الاحیاء و کیمیاء السعادة وجواهر القرآن لأنه بعد ما ذکر هذه الکتب الثلاثة ، قال : ثم ساقنی التقدیر الا لهی الی التصدر

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

للتدريس فكتب من تقريری فی علم اصول الفقه ، فحصلوا تصنيفاً علی طريق لم يقع مثله فی تهذيب الاصول فلما اكملوه عرضوه علی ، ولم اخيب سعيهم وسميته المنخول . (۱)

ابن سبکی کہتے ہیں کہ منخول کو امام غزالی نے اپنے استاذ امام الحرمین کے حین حیات تصنیف کیا ہے، جب کہ مستصفیٰ کی ابتداء میں امام غزالی کی تحریر کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ منخول احیاء، کیمیائے سعادت، اور جواہر القرآن کے بعد کی تصنیف ہے؛ کیوں کہ ان تین کتابوں کے ذکر کے بعد انھوں نے اس (منخول) کا ذکر کیا ہے، امام غزالی مزید فرماتے ہیں: پھر تقدیر الٰہی مجھے درس وتدریس کی جانب کھینچ کر لے گئے، طلبہ نے اُصول فقہ میں میرے لکچروں کو محفوظ کرلیا، ان محفوظ کردہ لکچروں کی بدولت تہذیب الاصول سے ہٹ کر نئے طریقہ کی تصنیف وجود میں آ گئی، میں نے طلبہ کی ان کوششوں کو نامراد نہیں کیا اور اس تصنیف کا نام ''المستصفیٰ'' رکھا۔

مرتضیٰ زبیدی کی اسی عبارت سے علامہ شبلی نعمانی کو بھی غلط فہمی ہوئی اور ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے بذات خود مستصفیٰ کا مقدمہ نہیں دیکھا تھا، ورنہ وہ اس غلطی میں ہرگز نہ پڑتے، مستصفیٰ کی عبارت علامہ مرتضیٰ زبیدی کی عبارت سے بالکل الگ ہے، مستصفیٰ کی عبارت ہے :

ثُمَّ اَقْبَلْتُ بَعْدَهُ عَلٰى عِلْمِ طَرِيقِ الْآخِرَةِ وَمَعْرِفَةِ اَسْرَارِ الدِّينِ الْبَاطِنَةِ فَصَنَّفْتُ فِيهِ كُتُبًا بَسِيطَةً كَكِتَابِ ''إِحْيَاءُ عُلُومِ الدِّينِ'' وَوَجِيزَةً كَكِتَابِ جَوَاهِرُ الْقُرْآنِ وَوَسِيطَةً كَكِتَابِ كِيمْيَاءُ السَّعَادَةِ ، ثُمَّ سَاقَنِي قَدَرُ اللهِ تَعَالٰى إِلٰى مُعَاوَدَةِ التَّدْرِيسِ وَالْإِفَادَةِ ، فَاقْتَرَحَ عَلَيَّ طَائِفَةٌ مِنْ مُحَصِّلِي عِلْمِ الْفِقْهِ تَصْنِيفًا فِي أُصُولِ الْفِقْهِ اَصْرِفُ الْعِنَايَةَ فِيهِ إِلَى التَّلْفِيقِ بَيْنَ التَّرْتِيبِ وَالتَّحْقِيقِ وَ إِلٰى التَّوَسُّطِ بَيْنَ الْإِخْلَالِ وَالْإِمْلَالِ عَلَى وَجْهٍ يَقَعُ فِي الْفَهْمِ دُونَ كِتَابِ ''تَهْذِيبِ الْاُصُولِ'' لِمَيْلِهِ إِلَى الِاسْتِقْصَاءِ وَالِاسْتِكْثَارِ ، وَفَوْقَ كِتَابِ ''الْمَنْخُولِ'' لِمَيْلِهِ إِلَى الْإِيجَازِ وَالِاخْتِصَارِ ، فَاَجَبْتُهُمْ إِلٰى ذٰلِكَ مُسْتَعِينًا بِاَللهِ ۔ (المستصفیٰ، ص:4)

(۱) اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین: ۱/ ۴۲، موسسۃ التاریخ العربی، بیروت، ط: 1994۔

مستصفیٰ کی عبارت نہایت واضح ہے، اس میں یہ قطعاً نہیں ہے کہ احیاء علوم الدین اور جواہر القرآن وغیرہ کے بعد منخول کی تصنیف عمل میں آئی ہے؛ بلکہ اس میں تو امام غزالی کہہ رہے ہیں کہ ان کے شاگردوں نے ان سے عرض کیا کہ وہ اُصولِ فقہ میں ایک کتاب لکھیں، جو ضخامت میں تہذیب الاصول سے کم اور منخول سے زائد ہو، اس میں یہ کہیں ذکر نہیں کہ منخول کب لکھی گئی ہے اور اس کی تصنیف کا زمانہ کیا ہے؟

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی نظر سے اس وقت تک المستصفیٰ نہیں گزری ہوگی؛ لہٰذا انھوں نے مرتضیٰ زبیدی کے کلام کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی؛ لیکن حاجی خلیفہ کی کشف الظنون تک تو علامہ شبلی نعمانی کی رسائی یقیناً تھی، پھر انھوں نے اس میں مستصفیٰ کے بارے میں اس عبارت پر غور کیوں نہیں کیا :

قال : فيه قد صنفت في فروع الفقه ، وأصوله : كتبا كثيرة ، ثم أقبلت بعده على علم طريق الآخرة ، فصنفت فيه : كتبا بسيطة : (كالإحياء) ، ووجيزة : (كجواهر القرآن) ، ووسيطة : (ككيمياء السعادة) ، ثم ساقني تقدير الله سبحانه وتعالى إلى معاودة التدريس ، فاقترح عليّ طائفة من محصلي علم الفقه : تصنيفا في الأصول ، أطلق العنان فيه : بين الترتيب ، والتحقيق ، على وجه يقع في الحجم دون : (تهذيب الأصول) ، وفوق : (كتاب المنحول) . (۱)

منخول کے متعلق ہی علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

منخول جو اُصول فقہ میں امام صاحب کی پہلی تصنیف ہے، ہماری نظر سے گزری ہے، بڑے معرکہ کی تصنیف ہے، اور چوں کہ آغاز شباب کی ہے، امام صاحب اس میں کسی امام یا مجتہد کے پابند نہیں؛ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں، نہایت بے باکی اور آزادی سے کہتے ہیں، صرف اس عیب کی وجہ سے یہ کتاب علماء کی نظر سے گر گئی، یہاں تک کہ شمس الائمہ کردری اس کو محمود معتزلی کی تصنیف بتاتے ہیں اور ابن حجر مکی الخیرات الحسان میں اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی کے اس اقتباس میں بھی کئی سقم ہیں، اولاً یہ بات نجانے انھوں نے کس بنیاد پر کہہ دی ہے کہ علماء کی نظر سے منخول اس لئے گر گئی کہ اس میں آزادی اور اجتہاد سے کام لیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ منخول ان کی

(۱) کشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون:2/1673۔ (۲) الغزالی،ص:53۔

ابتدائی تصنیف ہے اور المستصفیٰ آخری تصنیف، اور امام صاحب کی ابتدائی اور آخری حالت میں علم واعتدال کے لحاظ سے زمین وآسمان کا فرق ہے اور چوں کہ دونوں کتاب کا موضوع اُصول فقہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مستصفیٰ نہ صرف اُصول فقہ شافعی میں بلکہ مطلقاً اُصول فقہ میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ ہے، اس لئے اگر علماء نے خوبیوں کی بنیاد پر مستصفیٰ کو مرکز توجہ بنایا اور منخول گمنام ہوکر رہ گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، ایسا بھی بکثرت ہوا ہے کہ کسی مصنف نے کتاب لکھی اور اس کا کسی نے عمدہ خلاصہ لکھ دیا تو یہ خلاصہ ہی مقبول ومعروف ہوگیا اور اصل کتاب گم ہوکر رہ گئی۔

علامہ شبلی نعمانی کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ اس کتاب میں آزادی اور اجتہاد؛ بلکہ بے باکی سے کام لیا گیا ہے اور کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے، علامہ شبلی نعمانی نے منخول کو دیکھنے کا ذکر متعدد مرتبہ کیا ہے؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے منخول کا غائرانہ نہیں بلکہ طائرانہ مطالعہ کیا تھا، آسان اُردو میں کہیں تو سرسری طور پر نظر ڈال لی تھی، ورنہ شاید علامہ ایسا دعویٰ نہ کرتے، منخول اب طبع ہوچکی ہے، دیکھئے خود امام غزالی منخول کے آخر میں کیا فرماتے ہیں :

> هذا تمام القول فى الكتاب وهو تمام المنخول من تعليق الاصول بعد حذف الفضول وتحقيق كل مسألة بماهية العقول مع الاقلاع عن التطويل والتزام ما فيه شفاء الغليل والاقتصار على ما ذكره امام الحرمين رحمه الله في تعاليقه من غير تبديل و تزييد في المعنى و تعليل سوى تكلف في تهذيب كل كتاب بتقسيم فصول و تبويب ابواب روما لتسهيل المطالعة عند مسيس الحاجة إلى المراجعة والله أعلم بالصواب . (۱)

کیا امام غزالی کے اپنے اس اعتراف کے بعد کہ منخول مکمل طور پر یا تقریباً امام الحرمین کے تعالیق (نوٹس) پر مشتمل ہے، اس رائے کی کچھ اہمیت رہ جاتی ہے کہ :

> امام صاحب اس میں کسی امام یا مجتہد کے پابند نہیں؛ بلکہ جو کچھ کہتے ہیں ہیں، نہایت بے باکی اور آزادی سے کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے بیان کردہ بے باکی اور آزادی کی تان اس کتاب میں صرف امام ابوحنیفہ پر ٹوٹتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے شریعت کو پلٹ دیا اور شریعت کا جو مقصود تھا، اس کے برخلاف کیا، ورنہ جہاں تک آزادی، بے باکی اور کسی امام اور مجتہد کی عدم پابندی کی بات ہے تو وہ شافعی مسلک تو دور کی بات، خود امام الحرمین کے دائرہ اثر سے اس کتاب میں باہر نہیں نکلے ہیں۔

---

(۱) منخول، ص:618۔

علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ علامہ کردری اس کو کسی محمود معتزلی کی تصنیف بتاتے ہیں، یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے اور نہ جانے کہاں سے انھوں نے اس بات کو اخذ کیا ہے، دکتور عبدالرحمٰن بدوی نے اپنی بیش قیمت تالیف ''مولفات الغزالی'' میں شمس الائمہ کردریؒ کی اس کتاب کے — جو امام غزالی کے رد میں لکھی گئی ہے — ابتدائی صفحات کی عبارت نقل کی ہے، وہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں؛ تاکہ معلوم ہو کہ علامہ شبلی نعمانی کا یہ دعویٰ کہ علامہ کردری اس کو کسی محمود معتزلی کی تصنیف بتاتے ہیں، کس درجہ صحت سے بعید ہے :

والآن وقعت فی یدی جزارة مکتوب فیها ان اباحامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی ، احد روساء الشفعویة ، ذکر فی آخر کتابه المرسوم ''المنخول فی الاصول'' بابا قدم فیه مذهب الشافعی علی سائر المذاهب وفضله علی سائر اصحاب المناصب ... فقلت فی نفسی لا أتیقن بهذا مالم اطلع علی المرسوم بالمنخول فتوسلت بطریقة الی تحصیله فوجدته بعد جهد جهید فی زمان مدید فوجدته کما نسخ فی هذه الجزازة فاورد فی قلبی وجدا وحرازة ۔ (۱)

اس کے بعد شمس الائمہ کردری فرماتے ہیں کہ مجھ سے بعض لوگوں نے خواہش کی کہ میں اس کتاب پر رد لکھوں اور اس کتاب میں بیان کئے گئے تمام دعووں کا جائزہ لوں اور اس کے دعووں کو باطل ثابت کروں، اس کے بعد علامہ کردری بتاتے ہیں کہ یہ کتاب چھ فصل پر مشتمل ہوگی، اور یہاں سے کتاب کا باضابطہ آغاز ہوجاتا ہے، اس مقدمہ میں علامہ کردری نے کسی محمود معتزلی کا قطعاً ذکر نہیں کیا ہے، (۲) محمود معتزلی کا ذکر خیرات الحسان کے مولف ابن حجر ہیثمی نے کی ہے، (۳) ایسا لگتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کو اشتباہ ہوگیا، یا سبقت قلم کی وجہ سے ہیثمی کی جگہ کردری کا نام زبان پر آ گیا۔

مستصفیٰ کی تصنیف کی تکمیل کے مدت کی تعیین

مستصفیٰ کی تصنیف کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

اُصول فقہ میں مستصفی جوان کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، ۵۰۴ھ کی تصنیف ہے، جس سے ایک برس بعد امام صاحب نے انتقال کیا۔ (الغزالی، ص:37)

(۱) مولفات الغزالی، ص:14۔ (۲) مؤلفات الغزالی، ص:۸۔

(۳) دیکھئے: الخیرات الحسان، ص:۴، ط:۱۳۲۴، مطبع السعادة، مصر۔

علامہ شبلی نعمانی نے مستصفیٰ کے ۵۰۴ھ میں تصنیف ہونے کی بات کا کوئی حوالہ نہیں دیا، راقم نے بھی حتی الامکان موجود مراجع ومصادر میں تلاش کیا؛ لیکن اس کی تائید میں کچھ نہیں ملا، اس کے برخلاف علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں (جس کا حوالہ علامہ شبلی نعمانی نے بار ہا دیا ہے) لکھا ہے کہ مستصفیٰ ۶ رمحرم ۵۰۳ھ کی تصنیف ہے، اگر ہم محرم کے ۶ ردن نظرانداز کردیں تو یہ ۵۰۲ھ کی ہی تصنیف ٹھہرتی ہے۔

وله في أصول الفقه ''المستصفى'' فرغ من تصنيفه في سادس المحرم سنة ثلاث وخمسمائة ۔ (۱)

المضنون بہ علی غیر اهلہ

اس کتاب کے متعلق شروع سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ یہ امام غزالیؒ کی ہے یا پھر امام ان کی جانب کسی نے منسوب کردیا ہے، علامہ شبلی کی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب امام غزالی ہی کی ہے، اس کتاب کے متعلق وہ لکھتے ہیں :

اس کتاب کی نسبت محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی کا دعویٰ ہے کہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔(۲)

بات صرف ان دونوں ہی کی نہیں ہے ؛ بلکہ ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی اس کتاب کے امام غزالی کی تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے، علامہ ابن صلاح نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے :

انھوں نے المضنون بہ علی غیر اهلہ کا ایک نسخہ دیکھا، جس پر قاضی کمال الدین محمد بن عبداللہ بن قاسم شہروزی نے یہ لکھا تھا، یہ کتاب امام غزالی کی نہیں ہے ؛ بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی جانب منسوب کردیا ہے، یہ دراصل امام غزالی کی مقاصد ''الفلاسفۃ'' کا چربہ ہے، جس میں امام غزالی نے فلاسفہ کے خیالات اور اقوال بطور نقل قلم بند کئے ہیں، کسی نے اسی مقاصد الفلاسفہ سے فلسفیوں کے خیالات کو امام غزالی کی اپنی رائے کے طور پر منسوب کردیا ہے۔

ابن صلاح مزید کہتے ہیں اس میں فلسفیوں کے جن افکار کا تذکرہ ہے، امام غزالی نے تہافت میں ان کا رد کیا ہے :

قال الشيخ أبو عمرو ابن الصلاح : وأما (المضنون به على غير أهله) ، فمعاذ الله أن يكون له ، شاهدت على نسخة به بخط

(۱) وفیات الأعیان:4/218۔ (۲) الغزالی،ص:45۔

القاضي كمال الدين بن محمد بن عبد الله الشهرزوري أنه موضوع على الغزالي ، وأنه مخترع من كتاب (مقاصد الفلاسفة) ، وقد نقضه بكتاب التهافت . (۱)

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ قاضی کمال الدین شہرزوری اور ابن صلاح ایک ہی شہر شہرزور کے رہنے والے ہیں، کمال الدین شہروزی کی ولادت ۴۹۱ھ میں ہوئی، یعنی امام غزالی کے انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۱۵ سال رہی ہوگی، ایک لحاظ سے وہ امام صاحب کے کم سن معاصر ہیں، دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ امام غزالی کا ڈاکوؤں سے سابقہ پڑنے والا واقعہ کتب تراجم وتاریخ میں منقول ہے، وہ اسعد مہینی کے واسطہ سے ہے، یہ اسعد مہینی بڑی علمی شخصیت تھے، امام غزالی کے نہ صرف معاصر تھے؛ بلکہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان کے ہم نشیں بھی تھے، کمال الدین شہروزی اسی اسعد مہینی کے شاگرد ہیں، جس سے کمال الدین شہروزی کے امام غزالی کے تعلق سے کسی بات کی بھی اہمیت کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔(۲)

علامہ سبکی کے نامور ہم عصر محمد بن حسن بن عبداللہ حسینی واسطی (م:۷۷۶ھ) ہیں، ان کی تراجم ورجال میں ایک کتاب ہے جس کا نام ہے، الطبقات العلیۃ فی مناقب الشافعیۃ، یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے، اس کا مخطوطہ مصر وعرب کے کچھ کتب خانوں میں پایا جاتا ہے، اور اس مخطوطہ سے امام غزالی کا ترجمہ موقع الامام الغزالی پر بھی P.D.F میں دستیاب ہے، اس کتاب میں بھی حسن واسطی نے ''المضنون بہ علی غیر اھلہ'' کو امام غزالی کی تصنیفات میں مجہول صیغہ ذکر سے ذکر کیا ہے اور تردید میں ابن صلاح کا قول نقل کیا ہے؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

وقد ذكر أن من جملة مصنفاته ''المضنون به على غير اهله والمحققون انكروا ذالک ، قال الحافظ ابوعمرو رحمه الله : اما ''المضنون به على غيراهله'' فمعاذ الله أن يكون له ، شاهدت نسخة منه بخط القاضى كمال الدين محمد بن عبد الله الشهرزورى أنه موضوع على الغزالى وانه مخترع من كتاب مقاصد الفلاسفة وقد نقضه بكتاب التهافت ۔ (۳)

(۱) طبقات الشافعیین، ص:536۔

(۲) کمال الدین شہروزی کے ترجمہ کے لئے دیکھئے: وفیات الأعیان: 4/ 241، طبقات الشافعیہ الکبری للسبکی: 6/ 117، تاریخ الاسلام تبشار: 12/ 513، مجمع الآداب فی معجم الألقاب: 4/ 106۔

(۳) الملحق ترجمة الغزالى فى الطبقات العلية للواسطى، ص:180۔

علاوہ ازیں ابن عماد حنبلی نے بھی اس کتاب کوموضوع اورامام غزالیؒ کی جانب غلط طور پر منسوب بتایا ہے :

ویـنسب إلیه تـصنیفان لیسا له بل وضعاً علیه ، وهما ''السرّ المکتوم'' و ''المضنون به علی غیر أهله'' ۔ (۱)

علم اورتحقیق کی دنیا میں ایک بڑا نام علامہ طاش کبریٰ زادہ کا بھی ہے، علامہ طاش کبریٰ زادہ ''المضنون'' کی نسبت فرماتے ہیں :

و ینسب الیه تصنیفان لیساله ، بل وضعاً علیه وهما : ''السر المکتوم'' و ''المضنون به علی غیراهله''۔

امام غزالی کے حالات اوران کی کتابوں سے باخبر شخصیات میں ایک نمایاں نام علامہ مرتضی زبیدی کا بھی ہے، انھوں نے بھی المضنون بہ علی غیراھلہ کوجعلی اورموضوع تصنیفی قرار دیا ہے اورامام غزالی کی کتابوں کے ضمن میں ذکر نہ کرکے جعلی طور پرامام صاحب کی جانب منسوب کتابوں کے ضمن میں المضنون کا ذکر کیا ہے، ابن صلاح اورسبکی کے اقوال کے علاوہ انھوں نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے :

وفی المسامرة انه من تألیف علی بن خلیل البستی وکذلک صرح صاحب تحفة الارشاد بأنه مضوع علیه وقد صنف ابوبکر محمد بن عبد الله المالقی کتاباً فی رده وتوفی سنة ۷۵۰ھ۔ (۲)

علامہ امیر اسماعیل صنعانی کا نام علم وتحقیق کی دنیا میں غیرمعروف نہیں ہے، علم وتحقیق کی دنیا میں آپ کی مہارت اوررسوخ کے اہل علم معترف ہیں، علامہ امیر صنعانی بھی المضنون بہ علی غیراھلہ کوامام غزالی کی جانب منسوب جعلی تصنیف مانتے تھے، اوراس سلسلے کا یہ واقعہ دلچسپ ہے :

ایک مرتبہ علامہ صنعانی سخت بیمار پڑے اورکسی قسم کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اسی دوران ان کے پاس دو کتاب لائی گئی ، ایک تو علامہ جیلی کی الانسان الکامل اوردوسرے المضنون بہ علی غیراھلہ، آخر الذکر کتاب کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ امام غزالی کی کتاب نہیں ہے؛ بلکہ کسی جعل ساز نے ان کے نام کا استعمال کیا ہے، دونوں کتاب کے مطالعہ کے بعد علامہ صنعانی نے فرمایا کہ دونوں کتابوں میں صریح کفر موجود ہے، انھوں نے دونوں کتابوں کوجلانے کا حکم دیا اورکہا کہ ان دونوں

(۱) شذرات الذهب فی أخبار من ذهب:19/6۔

(۲) اتحاف السادۃ المتقین، مقدمہ، ص:۴۳۔

کتابوں کو چولہے میں جلا کر ان کے لئے روٹی پکائی جائے اور انھوں نے ان کتابوں پر پکی روٹی کو مرض سے شفا کی نیت سے کھایا تو اللہ کا کرم یہ کہ جس مرض کے علاج سے اطباء عاجز آ گئے تھے، اس روٹی کے کھانے سے شفا نصیب ہوگئی۔(۱)

علاوہ ازیں ماضی قریب کے مشہور عالم دین علامہ عبدالرحمٰن معلمی یمانی نے بھی المضنون بہ علی غیر اھلہ کو امام غزالی کی کتاب ماننے سے انکار کیا ہے۔(۲)

ماضی قریب کے ایک اور اہل علم جنھوں نے رجال اور ان کی تالیفات پر بڑا کام کیا ہے میری مراد خیرالدین زرکلی سے ہے، انھوں نے بھی الاعلام میں اس کتاب کی نسبت کو امام غزالی کی جانب مشکوک قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کتاب کی نسبت امام غزالی جانب درست ہونے میں کلام ہے۔(۳)

ابن تیمیہ اور المضنون بہ علی غیر اھلہ

متقدمین میں سے میرے علم کی حد تک صرف حضرت ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے زور وشور سے اس کتاب کی امام غزالی کی جانب نسبت کو نہ صرف صحیح قرار دیا ہے؛ بلکہ کہا ہے امام غزالی کی تصنیفات سے باخبر لوگ اس کتاب کو امام غزالی کی ہی مانتے ہیں اور اس کتاب کا مواد بھی ان کے دیگر کتابوں میں موجود مواد کے مشابہ ہے :

> و أما ''المضنون به على غير أهله'' فقد كان طائفة أخرى من العلماء يكذبون ثبوته عنه وأما أهل الخبرة به وبحاله فيعلمون أن هذا كله كلامه لعلمهم بمواد كلامه ومشابهة بعضه بعضاً ۔ (۴)

اس کے علاوہ بھی ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے اپنی مختلف تصنیفات میں المضنون بہ علی غیر اھلہ کو امام غزالی کی تصنیف قرار دیا ہے؛ لیکن یہ تصنیف ان کی ہے، اس کی دلیل میں انھوں نے محض یہ مجہول دعویٰ پیش کیا ہے کہ اس کتاب کے مضامین ان کی دیگر کتابوں کے مضامین سے مشابہت رکھتے ہیں اور یہ کہ امام غزالی کے احوال سے باخبر لوگ اس تصنیف کو ان کی ہی سمجھتے ہیں۔

---

(۱) مزالق الأصولیین وبیان القدر المحتاج إلیہ من علم الأصول، مقدمہ، ص:44، مکتبہ اہل الاثر، کویت۔

(۲) دیکھئے: حاشیہ الرد علی الأخنائی قاضی المالکیۃ، ص:48، المکتبۃ العصریۃ، بیروت۔

(۳) المضنون به على غير اهله، وفى نسبته إليه كلام، الأعلام للزركلى: 7/22۔

(۴) مجموع الفتاویٰ: 4/65۔

ابن تیمیہ علیہ الرحمہ نے امام غزالی کے حالات سے باخبر کسی ایسے شخص کا نام نہیں بتایا، جنھوں نے ''المضنون بہ علی غیر اھلہ'' کو صراحتاً امام غزالی کی تصنیف بتایا ہو، اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ ابن تیمیہ اشاعرہ کے سخت مخالف ہیں اور امام غزالی اشاعرہ کے صف کی نامور شخصیت؛ لہٰذا دونوں کا فکری اختلاف پوشیدہ نہیں ہے، امام غزالی سے ابن تیمیہ کا فکری اختلاف آگے چل کر اتنا بڑھا کہ اس نے ذاتی مخاصمت کی شکل اختیار کر لی اور ابن تیمیہ بھری مجالس میں امام غزالی پر انتہائی طعن وتشنیع کرنے لگے اور اس کی وجہ سے ایک مرتبہ شوافع نے ان پر حملہ بھی کیا؛ چنانچہ ابن حجر امام ابن تیمیہ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں :

وَكَانَ لتعصبه لِمَذْهَب الْحَنَابِلَة يَقع فِي الأشاعرة حَتَّى أنه سبّ الْغَزالِيّ فَقَامَ عَلَيْهِ قوم كَادُوا يقتلونه ۔ (۱)

جن سے فکری اختلاف ہوتا ہے، ان کے بارے میں فطری طور پر کوشش ہوتی ہے کہ ان کی کوئی کمزوری ہاتھ آئے تو اس کی گرفت کی جائے، ابن تیمیہ کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ ان کو اشاعرہ پر حملہ کرنے کے لئے مواد دستیاب ہو، اور ظاہر سی بات ہے کہ ''المضنون بہ علی غیر اھلہ'' میں ان کو اشاعرہ پر اور امام غزالی پر حملہ کرنے کے لئے بہت مواد ملتا ہے، اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اس کتاب کو امام غزالی کی ہی تسلیم کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مضامین کی مشابہت کسی کتاب کو کسی مصنف کی جانب نسبت کے لئے کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، جعلی تصنیف کرنے والوں کا طریق واردات یہی ہوتا ہے کہ وہ اسی مصنف کی دیگر کتابوں کی عبارتیں اور مضامین استعمال کرتے ہیں اور درمیان میں کچھ اپنی جانب سے بڑھا دیتے ہیں؛ تاکہ عام لوگوں کو تمیز کرنے میں دشواری ہو۔

عصر حاضر میں عبدالرحمٰن بدوی نے مولفات الغزالی کے نام سے امام غزالی کی تالیفات پر نہایت بیش قیمت کتاب لکھی ہے، جس میں امام غزالی کی جانب صحیح طور پر منسوب کتابیں، راجح طور پر منسوب کتابیں، موضوع اور گڑھی ہوئی کتابوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے، المضنون بہ علی غیر اھلہ میں دکتور عبدالرحمٰن بدوی کنفیوز نظر آتے ہیں؛ کیوں کہ ایک جانب تو وہ اس کتاب کو صحیح نسبت والی کتابوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں، دوسری طرف اسی کتاب کے ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ ابن صلاح اور سبکی کے دلائل نہایت مضبوط ہیں، (۲) اس کے علاوہ عبدالرحمٰن بدوی اس کتاب کی امام غزالی کی جانب نسبت پر علماء کے اختلاف اور دلائل میں تعارض کو دیکھتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں :

(۱) الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة: ۱/۱۷۹۔ (۲) مولفات الغزالی، ص: ۱۵۴۔

وعلیٰ کل حال فان کتاب ''المضنون'' یثیر مشکلات عدیدۃ لا نستطیع ھنا فی ھذا المجال الاستمرار فی اثارتھا وتحلیلھا ۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کا مضنون کے منکرین پر رد

علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں :

اس کتاب کی نسبت محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی کا دعویٰ ہے کہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہوسکتی، دلیل یہ ہے کہ اس کتاب کا مصنف قدم عالم، انکار علم جزئیات اور نفی صفات کا قائل ہے، اور ان میں سے ہر عقیدہ کفر کا مستوجب ہے۔(۲)

آگے مزید فرماتے ہیں :

لطف یہ کہ یہ مسائل مضنون بہ علی غیر اھلہ میں سرے سے مذکور ہی نہیں، علامہ ابن الصلاح وابن السبکی نے معلوم نہیں کن الفاظ سے یہ مسائل مستنبط کئے، یہ کتاب عام طور پر شائع ہوچکی ہے، اور ہر شخص خود دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے۔(۳)

اب ہم اسی کتاب سے اس مضمون کی کچھ عبارتیں نقل کریں گے، جس سے پتہ چلے گا کہ اس کتاب میں یہ عبارتیں موجود ہیں یا نہیں ہیں۔

کتاب کی سب سے پہلی عبارت ہے :

الزمان لایکون محدودا وخلق الزمان فی الزمان امر محال ۔ (۴)

اسی طرح نفی صفات کے متعلق فرماتے ہیں :

یتخیل بعض کثرۃ فی ذات اللہ من طریق تعدد الصفات وقد صح قول من قال فی الصفات : لا ھو ولا غیر ، وھذا التخیل یقع فی توھم التغیر ولا تغایر فی الصفات ۔ (۵)

---

(۱) مولفات الغزالی،ص:155۔

(۲) الغزالی،ص:45۔

(۳) الغزالی،ص:46-47۔

(۴) مجموعۃ رسائل الامام الغزالی، المضنون بہ علی غیر اھلہ،ص356۔

(۵) مجموعۃ رسائل الامام الغزالی، المضنون بہ علی غیر اھلہ،ص356۔

امام غزالی کی تالیفات پر گہری نگاہ رکھنے والے عبدالرحمٰن بدوی نے بھی ان اقتباسات کو علامہ سبکی و ابن صلاح کی تائید کے طور پر پیش کیا ہے ، ہاں اس کا اعتراف کیا ہے اس بارے میں اگرچہ امام غزالی کی صریح اور نہایت واضح عبارت اس کتاب میں نہیں ہے ؛لیکن پیش کی گئی عبارات سے ضمنی طور پر وہی مطلب نکل رہا ہے جو علامہ سبکی و ابن صلاح نے سمجھا ہے، یعنی قدم عالم اور صفات کا انکار، پتہ نہیں علامہ شبلی نعمانی کے پاس ''المضنون بہ علی غیر اھلہ'' کا کون سا نسخہ تھا، جس میں ان کو یہ عبارتیں نہیں مل سکیں، یہ مزید حیرت کی بات ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کو چھوڑ کر مجھے کسی دوسرے اہل علم کا پتہ نہیں، جس نے اس کتاب میں ان مسائل کے ہونے سے انکار کیا ہو۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

> رجال کی جس قدر مستند کتابیں ہیں، سب میں اس کتاب کو امام صاحب کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔(۱)

قارئین !اس موقع پر امام غزالی کی وہ ابتدا کی عبارت یاد کرلیں جہاں انھوں نے سبکی کی طبقات الشافعیۃ الکبریٰ کو رجال کی سب سے جامع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام غزالی کے احوال جس قدر اس کتاب میں ہیں ، دوسروں میں اس سے زائد تو کجا اس کے برابر بھی نہیں مل سکتا ، (۲) لیکن مضنون کے باب میں لگتا ہے کہ طبقات الشافعیۃ کی رجال کی جامع ترین کتاب ہونے کی حیثیت ختم ہوگئی اور جامع ترین ہی کیا رجال کی مستند کتاب ہونے کی ہی حیثیت ختم ہوگئی ؛ کیوں کہ علامہ شبلی نعمانی فرما رہے ہیں :

> رجال کی تمام مستند کتابوں میں اس کتاب کو امام غزالی کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔(۳)

اور واقعہ یہ ہے کہ سبکیؒ کی طبقات میں اس کتاب کے امام غزالی کی تصنیف ہونے سے انکار کیا گیا ہے، اس کتاب کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل قدر ہے امام غزالی کی کتابوں سے شغف رکھنے والے دکتور مشہد علاف نے بھی اس کتاب کو جعلی مانا ہے اور اس کے لئے کتاب کی اندرونی شہادتیں یہ پیش کی ہیں :

(۱) امام غزالی کی عادت یہ نہیں ہے کہ وہ کتاب کو کسی شخصیت کے نام معنون یا منسوب کریں، اس کتاب کو انھوں نے اپنے بھائی احمد کے نام منسوب کیا ہے۔

(۲) اس کتاب کے جتنے بھی نسخے تاحال ملے ہیں، وہ تمام کے تمام گیارہویں ہجری کے بعد کے ہیں ، یعنی امام غزالی کے انتقال کے تقریباً چھ سو سال بعد کے ہیں۔

---

(۱) الغزالی، ص:54۔

(۲) الغزالی، ص:12۔

(۳) الغزالی، ص:45۔

(۳) ہر مصنف کا ایک اُسلوب ہوتا ہے، جس میں اس کی شخصیت کی جھلک ہوتی ہے، امام غزالی کا بھی اپنا ایک طاقتور اور موثر اُسلوب ہے جس سے انھوں نے تصنیفات و تالیفات میں کام لیا ہے اور جو ان کی پہچان وشناخت ہے، اس کے برخلاف اس کتاب کا اُسلوب، یا طرز تعبیر نہایت کمزور ہے، اور اس سے ذہن ودماغ پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا۔

(۴) اس میں استعمال کردہ اصطلاحات عجیب وغریب ہیں، جس کو امام غزالی نے دیگر کتابوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔

(۵) امام غزالی کی کتابوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی ترتیب بہت منطقی اور منظم ہوتی ہے، اس کے برخلاف اس کتاب کی ترتیب انتہائی غیر منظم اور غیر مرتب ہے، مختلف ابواب، فصول اور ابحاث کے درمیان کوئی ترتیب اور تنظیم نہیں ہے۔

(۶) امام غزالی فصیح وبلیغ زبان اور تعبیر استعمال کرتے ہیں، اس کتاب کی زبان اور تعبیر رکیک اور گھٹیا ہے، جیسے: ''مادة الارض مادة مشتركة بين ازواج وفحول وهى الاخس لانها مثل مومسة تقبل كل ناكح''۔

(۷) بعض ایسی باتیں کتاب میں ہیں، جن کا صدور کسی عقل والے سے بھی ممکن نہیں چہ جائے کہ امام غزالی جو دنیا کے ذہین ترین لوگوں میں سے ایک ہیں، جیسے :

> وقد تتولد العقارب من الباذروج و لباب الخبز والحيات من العسل ، والنحل من العجل المنخق المنكسرة عظامه والبق من الخل ۔

علامہ شبلی نعمانی کہتے ہیں :

> اس سے بڑھ کر یہ خود امام صاحب نے جواہر القرآن میں جو ان کی مسلمہ تصنیف ہے، اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔(۱)

معلوم نہیں علامہ شبلی نعمانی کے پاس جواہر القران کا وہ کون سا نسخہ تھا، جس میں امام غزالی نے المضنون بہ علی غیر اھلہ کا ذکر کیا ہے، ورنہ تو جواہر القرآن کا جو نسخہ دستیاب ہے، اور جو رشید رضا قبانی کی تحقیق سے داراحیاء العلوم مصر سے شائع ہوئی ہے، اس میں تو المضنون بہ علی غیر اھلہ کا دُور دُور تک کوئی ذکر نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ امام غزالی نے المبحث الثانی علوم اللباب کے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے کہ :

(۱) الغزالی، ص:55۔

انھوں نے بعض تصانیف میں حقائق کا ذکر کیا ہے، جو عام لوگوں کی سمجھ اور فکر سے باہر ہیں، اور ان حقائق کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے علوم ظاہر کی تکمیل کر رکھی ہو، اور نفس کو مجاہدات کی مشقتوں سے رذائل سے منزہ اور فضائل وخصائل سے مزین کر چکا ہو اور دنیا کی لذات وشہوات سے کنارہ کشی کر چکا ہو، ان سب کے ساتھ ذہانت، فطانت اور حقائق کو سمجھنے کی لیاقت ہو، پھر ساتھ ہی یہ بھی نصیحت کی ہے کہ اگر ایسے لوگوں کے ہاتھوں ان کی حقائق واسرار کی کوئی کتاب ہاتھ لگے تو اس کو عام نہ کرے؛ بلکہ جس کے اندر یہ شرائط پائی جائیں، ان کو ہی ان حقائق کی تعلیم دی جائے۔(۱)

امام غزالی نے یہ سب باتیں کہیں ضرور اور یہ بھی کہا کہ ان کی بعض تصانیف میں حقائق ومعارف یا اسرار ہیں؛ لیکن کسی تصنیف کا نام نہیں لیا، علامہ شبلی نے جو نسخہ دیکھا ہوگا، شاید اس میں کاتب کی مہربانی رہی ہوگی، ورنہ اگر امام غزالی کی جواہر القرآن میں المضنون بہ علی غیر اھلہ کا ذکر ہوتا تو ابن صلاح اور سبکی سے لے کر ابن تیمیہ اور ذہبی تک اور مرتضی زبیدی وغیرہ یا جن لوگوں نے اس کتاب پر لکھا ہے، کوئی تو لکھتا کہ المضنون بہ علی غیر اھلہ کا ذکر جواہر القرآن میں موجود ہے؛ لیکن میرے محدود علم کی حد تک کسی نے بھی المضنون بہ علی غیر اھلہ کے ثبوت کے لئے جواہر القرآن کا حوالہ نہیں دیا ہے، جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ المضنون بہ علی غیر اھلہ کا ذکر جواہر القرآن میں نہ تھا اور نہ ہے، اور علامہ شبلی نعمانی نے جس نسخہ میں دیکھنے کا ذکر کیا ہے، اس بارے میں یا تو ان سے نگاہ کی چوک ہوئی ہے، یا پھر کسی محرف نسخہ میں دیکھا ہوگا، جس کی تحریف پر وہ مطلع نہیں ہو سکے۔

● ● ●

(۱) جواہر القران، ص:43۔

حضرت مولانا اسرارالحق قاسمیؒ
نامور قائد، عالم اور باکردار شخصیت

خالد سیف اللہ رحمانی

مونگیر (بہار) میں مغلیہ طرزِ تعمیر کی بنی ہوئی ایک قدیم جامع مسجد ہے، خوبصورت بھی اور پُرشکوہ بھی، یہاں پہلے مولانا عبداللہ بخاری نام کے بزرگ امام وخطیب تھے، یہ بخاریٰ کے رہنے والے تھے، اور جامع مسجد دہلی کے امام یعنی موجودہ امام احمد بخاری کے والد سے غالباً ان کی خاندانی قرابت تھی، اس مسجد میں ایک دینی درسگاہ مدرسہ تجوید القرآن کے نام سے قائم ہے، موجودہ صورتِ حال تو نہیں معلوم؛ لیکن اُس وقت یہاں حفظ وناظرہ کے علاوہ ابتدائی عربی جماعتیں بھی قائم تھیں، اس ادارہ کے سرپرست حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ (سابق صدر جمعیۃ علماء ہند) تھے، مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا، راقم الحروف اُس وقت اسی شہر کی معروف دینی درسگاہ جامعہ رحمانی مونگیر میں زیرِ تعلیم تھا۔

اُس وقت جلسہ سننے کا بڑا شوق سر میں سمایا رہتا تھا؛ چنانچہ ہم چند ساتھی چھپ چھپا کر جامع مسجد پہنچے؛ کیوں کہ مغرب بعد کہیں بھی جانے کی ممانعت تھی، وہاں مولانا مدنی کے علاوہ ایک اور وجیہہ وباوقار شخصیت حضرت مولانا شاہ عون احمد قادریؒ کی بھی تھی، جو خانقاہ مجیبیہ کے بزرگوں میں تھے اور جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے، اس موقع پر ایک صاحب کا خطاب ہوا، سانولا رنگ، سیاہ ریش، شاید دو چار بال سفید رہے ہوں، کھدر کا کُرتا پائجامہ، اور گاندھی ٹوپی، تبسم ریز چہرہ اور سادگی وانکساری کا پیکر، محسوس ہوا کہ وہ مولانا مدنیؒ کو بہت محبوب ہیں اور وہ تھے بھی اسی لائق، یہ تھے حضرت مولانا اسرارالحق قاسمیؒ، حفظ قرآن مجید کے اختتام اور حفاظ کی دستار بندی کی مناسبت سے قرآن مجید کے فضائل اور اس کے سائنسی معجزات پر آپ کا خطاب ہوا، اور کائنات میں پھیلی ہوئی حقیقتوں کے بارے میں قرآن مجید میں جو باتیں کہی گئی ہیں، جو یقیناً نزول قرآن مجید کے وقت پردۂ خفاء میں تھیں، اور موجودہ سائنسی ترقی کے دور میں ان کا انکشاف ہوا ہے، بہت ہی خوبصورتی اور خوش اُسلوبی کے ساتھ مولانا نے ان کو واضح فرمایا، جب خطاب ختم ہوا تو ہر شخص کی زبان پر تحسین وآفریں کے کلمات تھے، خود شاہ عون احمد قادری صاحبؒ نے بھی کہا کہ کاش، مولانا کا خطاب اور دراز ہوتا، ظاہر ہے کہ مقرر بھی اپنی تقریر کے لئے کتابوں ہی سے مواد حاصل کرتا ہے، بعد کو

اندازہ ہوا کہ اس خطاب میں مولانا وحید الدین خان صاحب کی مشہور ومقبول تالیف ''علم جدید کا چیلنج'' کو سامنے رکھا گیا تھا، یہ کتاب ابھی نئی نئی آئی تھی، اور بیشتر لوگ اس سے واقف نہیں تھے، یہ مولانا کے ذوقِ مطالعہ کی بات ہے کہ انھوں نے موضوع سے متعلق اس اہم کتاب تک رسائی حاصل کی اور اس مضمون کو اتنے آسان اُسلوب اور خوبصورت زبان میں پیش کیا کہ عامی سے عامی بھی سمجھ جائے، یہی خطاب اس جلسہ کا حاصل تھا، ہم لوگ بھی بہت متأثر ہوکر واپس آئے، یہ مولانا کا پہلا دیدار تھا۔

آپ ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اور ایک سال مدرسہ رحیمیہ مدھے پورہ میں تدریسی خدمت انجام دے کر ۱۹۶۸ء میں مدرسہ بدرالاسلام بیگوسرائے سے متعلق ہوگئے، اور ۱۹۷۳ء تک یہیں خدمت کرتے رہے، پھر آپ کے جوہر قابل کا اندازہ کر کے جمعیۃ علماء ہند نے آپ کی خدمات حاصل کیں، آپ کی فرض شناسی، جذبۂ خدمت اور تعمیری اندازِ فکر کو دیکھ کر ۱۹۸۰ء میں جمعیۃ علماء کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا، ۱۹۹۱ء تک آپ اسی عہدہ پر قائم رہے، اور آپ نے خود اپنی مرضی سے استعفیٰ دے دیا۔

جمعیۃ علماء کے تحت آپ نے جو گراں قدر اور ہمہ جہت ملی خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں، اسی زمانہ میں جمعیۃ علماء نے ''ملک وملت بچاؤ تحریک'' شروع کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے مہم چلائی، اور آپ نے پوری سرگرمی کے ساتھ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی سب سے زیادہ معتمد شخصیت کی حیثیت سے ان تحریکوں میں نمایاں کردار ادا کیا، جمعیۃ سے وابستگی کے دوران آپ نے شہر شہر، گاؤں گاؤں کا دورہ کیا، ملک بھر میں کتنے گاؤں ہیں، جن میں مسلمانوں کی آبادی ہے، کتنے گاؤں میں مسجدیں ہیں اور کتنے گاؤں میں نہیں ہیں، کتنی جگہ مکتب کا نظام قائم ہے اور کہاں نہیں ہے، ہندوستان بھر میں کہاں کہاں مدارس کا نظام قائم ہے؟ آپ کو ان سب کے بارے میں وسیع معلومات تھیں، اور جب ان سب کا ڈاٹا سناتے تھے تو حیرت ہوتی تھی۔

۱۹۹۱ء میں آپ کے بشمول جمعیۃ علماء ہند کے کئی عہدہ دار مستعفی ہوگئے؛ لیکن آپ کی صلاحیت اور مزاج کی وجہ سے تنظیم کے سربراہ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ چاہتے تھے کہ آپ واپس آجائیں، اسی زمانہ میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی تحریک پر آل انڈیا ملی کونسل کا قیام عمل میں آیا، قاضی صاحبؒ اور کونسل کے دوسرے بڑے ذمہ دار ڈاکٹر منظور عالم صاحب نے آپ کو ملی کونسل کے لئے دعوت دی، آپ اس کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اور کونسل کو ملک میں متعارف کرانے اور اس کی آواز دور دور تک پہنچانے میں بڑا فعال کردار ادا کیا؛ لیکن شاید یہاں کا قیام بھی راس نہیں آیا، اور آپ نے اس عہدہ سے علاحدگی اختیار کی، بہر حال بعد کو آپ نائب صدر منتخب ہوئے اور تا دمِ حیات اس عہدہ پر قائم رہے۔

بالآخر مولانا کے اندر شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ ملت کی زبوں حالی کا اصل سبب تعلیمی پسماندگی ہے، اور بالخصوص ان کے علاقہ سیمانچل میں مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت ہی پسماندہ ہیں؛ اس لئے آپ نے ۲۰۰۰ء میں آل انڈیا ملی تعلیمی فاؤنڈیشن قائم کیا، اس کے تحت کشن گنج میں ملی گرلز اسکول کی بنیاد رکھی، جو ماشاء اللہ اب بھی ترقی کا سفر طے کر رہا ہے، اس کے علاوہ بہار، جھارکھنڈ، بنگال اور یوپی کی خستہ حال مسلم بستیوں میں مکاتب اور تحفیظ القرآن کے بعض مدارس قائم کئے، تعلیم کے میدان میں مولانا کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ کشن گنج میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی برانچ کا قیام ہے، آپ نے اس کے لئے بڑی جدوجہد کی، ۲۱/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو کشن گنج میں بڑا دھرنا دیا، جس میں تقریباً چار لاکھ افراد شریک ہوئے، بالآخر نتیش کمار کی حکومت نے اس مقصد کے لئے دو سو چوبیس ایکڑ زمین دی اور اس برانچ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، حقیقت یہ ہے کہ بہار و بنگال کے مسلمانوں پر یہ مولانا کا عظیم احسان ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

وہ ایک کامیاب مقرر تھے، جس موضوع پر گفتگو کرتے، اس کے مالہ وما علیہ کو سامنے رکھتے اور تقریر میں نصح وموعظت کے ساتھ ساتھ علمی پہلو بھی شامل ہوتا، اسی طرح اللہ نے آپ کو تحریر کا ذوق بھی عطا فرمایا تھا، آپ کا ہفتہ وار کالم پابندی سے روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوتا تھا، اور دوسرے اخبارات بھی اس کو نقل کیا کرتے تھے، غالباً آپ کی پہلی تالیف ''مسلم پرسنل لا اور ہندوستانی مسلمان'' ہے، یہ اس زمانہ کی تالیف ہے جب آپ مدرسہ بدرالاسلام بیگوسرائے میں ناظم تعلیمات تھے، جمعیۃ علماء کی نظامت کے زمانہ میں آپ کے قلم سے بہت سے کتابچے شائع ہوئے، جو زیادہ تر مختلف میدانوں میں جمعیۃ علماء کی خدمات اور اس کی پالیسیوں سے متعلق ہیں، بعد کو آپ نے جو کالم لکھنا شروع کیا، ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن سے آپ کی بصیرت اور دینی حمیت کا اندازہ ہوتا ہے، کاش، مولانا کے اخلاف اور ملی فاؤنڈیشن کے ذمہ داران ان مضامین کو مرتب کر کے منظر عام پر لائیں!

مولانا کی خدمات کا ایک اہم باب سیاسی جدوجہد ہے، انھوں نے جذبۂ خدمت کے تحت کئی بار کشن گنج سے ایم پی کا الیکشن لڑا؛ لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی، بالآخر یہ کوشش ۲۰۰۹ء میں کامیابی کی منزل کو پہنچی، جب پندرھویں لوک سبھا کے لئے کانگریس نے انھیں کشن گنج سے ٹکٹ دیا، ۲۰۱۴ء میں دوبارہ کشن گنج سے کامیابی حاصل کی؛ لیکن افسوس کہ اس مدت کے پورے ہونے سے پہلے ہی راہی بقاء ہو گئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ جو عمر انسان کی جدوجہد کی ہوتی ہے، اس وقت مولانا پارلیامنٹ میں نہیں پہنچ سکے، اگر ایسا ہوتا تو آپ کی اور بھی گراں قدر خدمات سامنے آتیں؛ لیکن اس اخیر عمر میں بھی آپ نے اس طرح پارلیامنٹ میں نمائندگی کی کہ آپ کی حاضری ۸۸ فیصد رہی، اگرچہ اس دوران ایک تکلیف دہ واقعہ پیش آیا کہ جب لوک سبھا میں تین طلاق بل پیش ہوا تو اس پر آپ کچھ

بول نہیں سکے، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑی شکایت پیدا ہوئی؛ لیکن بعد کو یہ بات واضح ہوئی کہ اس میں مولانا کی غفلت اور ایک شرعی مسئلہ سے بےتعلقی کا دخل نہیں تھا؛ بلکہ ہمارے پالیمانی نظام میں پارٹی مختلف مسائل پر بولنے کے لئے اپنے ارکان کو نامزد کرتی ہے، اور باوجود خواہش کے مولانا کو اس بل پر اظہار خیال کا موقع نہیں دیا گیا؛ تاہم آپ نے راجیہ سبھا میں اس کی تلافی کی، اور کانگریس قائدین کو قائل کیا کہ انھیں اس بل کی مخالفت کرنی چاہئے؛ کیوں کہ یہ قانون شریعت میں مداخلت ہے؛ چنانچہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور راجیہ سبھا میں بل منظور نہیں ہوا۔

تواضع، سادگی، صبر وشکر، قناعت ایسے اخلاقی اوصاف تھے کہ گویا خلاق ازل نے اسے مولانا کے خمیر میں رکھ دیا ہو؛ لیکن راقم الحروف ان کی جس بات سے سب سے زیادہ متأثر ہوا، وہ ہے زبان کی حفاظت، وہ ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء میں رہے اور ایک سرگرم کارکن سے لے کر اعلیٰ ذمہ دار تک خدمت انجام دی، پھر تنظیمی اختلافات کی وجہ سے علاحدہ ہوئے؛ لیکن جمعیۃ سے الگ ہونے کے بعد کبھی انھوں نے جمعیۃ علماء اور اس کے سربراہ مولانا اسعد مدنیؒ کے بارے میں زبان نہیں کھولی، میرے سامنے بھی بعض لوگوں نے ان کو چھیڑنا اور کُریدنا چاہا؛ لیکن وہ بہت خوش اُسلوبی کے ساتھ ٹال گئے، ملی کونسل میں بھی وہ اپنی فعال حیثیت سے دستبردار ہوئے اور بعض شکایتیں بھی پیش آئیں، جو عموماً اجتماعی اداروں اور تنظیموں میں ہوا کرتی ہیں؛ لیکن کبھی منفی طریقہ پر اس کا ذکر نہیں کیا، یہ بہت بڑا وصف ہے اور بڑے ظرف کی بات ہے، جو کم لوگوں میں پایا جاتا ہے؛ اسی لئے مولانا اسعد مدنیؒ سے اخیر دم تک ان کے ذاتی تعلقات خوشگوار رہے۔

مجھے کئی میٹنگوں میں ان کے ساتھ شرکت کا موقع ملا اور میرا تجربہ ہے کہ وہ مشورہ میں مخلص ہونے کے علاوہ صائب الرائے بھی تھے، اُن کے مشورے حکمت اور معاملہ فہمی پر مبنی ہوتے تھے، تجاویز کی ترتیب اور الفاظ کی نشست و برخاست کو درست کرنے میں انھیں بڑا ملکہ تھا، وہ جس کسی سے ملتے بہت ہی خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے، اور تبسم ریز چہرہ سے ہر آنے والے کا استقبال کرتے، اپنے اس وصف کی وجہ سے تمام ملنے والوں کے دلوں میں ان کی محبت جاں گزیں تھی، مئو اور اعظم گڑھ کا علاقہ ان کے علاقہ سے خاصی دوری پر تھا؛ لیکن ان کی محبت نے پورب کے اس علم خیز خطہ کے لوگوں کو فتح کرلیا تھا۔

وہ تاراباری، کشن گنج (بہار) میں ۵ر فروری ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے، والد ماجد کا نام منشی امین اور والدہ ماجدہ کا نام آمنہ خاتون تھا، ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند گئے، اور ۱۹۶۴ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، یہاں آپ کو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد قاری طیب صاحبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد فخر الدین احمد صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ اور حضرت مولانا انظر شاہ

کشمیریؒ وغیرہ جیسے بلند پایہ اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملا، احسان وسلوک کی منزلیں بھی طے کیں، اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی کی طرف سے خلافت سے نوازے گئے، اور بالآخر مختصر علالت کے بعد ۹/دسمبر ۲۰۱۸ء کو اس شان سے بارگاہ الٰہی میں پہنچے کہ نماز تہجد کے لئے اُٹھے، دل میں درد ہوا، سیکوریٹی گارڈ سے ہسپتال لے جانے کو کہا اور فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جا رہا ہوں، یہ بھی کہا کہ مجھے معاف کر دو اور تمام لوگوں سے کہو کہ مجھے معاف کر دیں، پھر ہاسپٹل پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی وفات ہو گئی، اس طرح مسافر آخرت سفر پر روانہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور جن اداروں کو وہ چھوڑ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے اس بندہ کے حق میں صدقۂ جاریہ بنادے۔

• • •

رپورٹ دوروزہ تربیتی پروگرام

فضلاءمعہد 2000ء-2010ء

منعقدہ:9-10رفروری2019ء،مطابق:3-4رجمادی الاخری1440ھ

المعہد العالی الاسلامی کے قیام کا ایک بڑا مقصد افراد سازی ومردم گری ہے، کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی وفکری تربیت اس ادارہ کے مشن کا حصہ ہے، اسی غرض سے معہد نے اس سال دوروزہ تربیتی پروگرام منعقد کیا، یہ پروگرام ۳-۴رجمادی الاخری ۱۴۴۰ھ، مطابق:۹-۱۰رفروری ۲۰۱۹ء بروز ہفتہ واتوار معہد کے احاطہ میں منعقد ہوا، اس پروگرام میں معہد کے ان فضلاء کو دعوت دی گئی، جنھوں نے ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۰ء کی درمیانی مدت میں فراغت حاصل کی، اس دوروزہ پروگرام میں شہروبیرون شہر کے مؤقر محاضرین نے نہایت اہم موضوعات پر قیمتی محاضرات پیش کئے، پروگرام مجموعی اعتبار سے سات نشستوں پر مشتمل تھا، جن میں افتتاحی اور اختتامی نشست کے علاوہ پانچ نشستیں صرف محاضرات کے لئے مختص تھیں، اخیر میں ایک شعری نشست کا بھی انعقاد عمل میں آیا۔

☆ افتتاحی نشست

یہ نشست معہد کے بانی وناظم حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کی صدارت میں منعقد ہوئی، صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی نے افتتاحی کلمات پیش کئے، معہد کے ایک باوقار ٹرسٹی ڈاکٹر مولوی اقبال احمد انجینئر نے خیر مقدمی کلمات پیش کئے۔

مولانا شاہ جمال الرحمٰن صاحب مفتاحی نے اپنے افتتاحی کلمات میں فضلاء کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے اعضاء وجوارح دراصل خادم ہیں، یہ کوئی کام خود سے نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ اندرون سے جو حکم آتا ہے، اس کو پورا کرتے ہیں، دل اور نفس کے تقاضے کی تکمیل کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ فساد وبگاڑ کا تعلق اعضاء وجوارح سے نہیں ہے؛ بلکہ کہ اس کا تعلق اندرون کے بگاڑ اور قلب کے فساد سے ہے، باطنی اصلاح اور اندرونی درستگی پر پوری زندگی کی اصلاح ودرستگی کا مدار ہے، مولانا مفتاحی نے طلبہ کو تزکیۂ نفس پر زور دینے کی تلقین فرمائی، مولانا نے فرمایا کہ انسان اور جنت کے درمیان صرف دوقدم کا فاصلہ ہے، پہلا قدم نفس پر رکھئے، دوسرا قدم خود بہ خود جنت میں پڑے گا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے صدارتی خطاب میں معہد کے مقصد اور معہد کے کام کی روح پر تفصیل سے روشنی ڈالی، مولانا نے فرمایا کہ اس ادارے کا مقصد اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے ''افراد سازی'' اور افراد سازی میں احسان کی تربیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، احسان کا مطلب ہے کہ کسی بھی کام کو ظاہر و باطن ہر دو اعتبار سے عمدہ طریقہ پر سرانجام دینا، اسی طرح مولانا نے فرمایا کہ معہد کے کام کی جو روح ہے وہ دو باتیں ہیں: اعتدال اور نافعیت، نافعیت کے لئے ایک ضروری چیز عصریت ہے، یعنی زمانہ سے ہم آہنگی، وقت اور حالات سے مطابقت، اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اُمتوں کی شریعتوں میں تبدیلی اس لئے فرمائی کہ ہر زمانہ کی شریعت اپنے زمانہ سے ہم آہنگ ہو سکے۔

مولانا نے معہد کے فضلاء کو خطاب و بیان کے تعلق سے کئی اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی، مولانا نے فرمایا کہ بیان کسی پیغام پر مشتمل ہو، زبان آسان ہو، موقع وحالات سے مطابقت ہو، اختصار اور جامعیت ہو، موضوع مرتب ہو، مقررہ وقت کا لحاظ ہو، موضوع پر ارتکاز ہو، مولانا نے سلسلۂ خطاب جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بیان سے پہلے مطالعہ کرلیا جائے، مستند بات کہی جائے، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور آثارِ صحابہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔

خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال احمد انجینئر نے کہا کہ معہد ایک ایسا ادارہ ہے جس میں پڑھائے جانے والے کورسیز ہمہ جہتی و ہمہ مقصدی ہیں، یہاں کے فضلاء نے زندگی کے تمام میدانوں میں رہنمائی کی ہے اور کر رہے ہیں۔

اس افتتاحی نشست کی نظامت مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے انجام دی، نشست کا آغاز یوسف بن مطیع الحق ندوی (طالب معہد) کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، مولوی عزیر فلاحی (شعبۂ تحقیق) نے نعت کا نذرانہ پیش کیا، مولانا خالد ندوی (ریسرچ اسکالر: ایم ایس اکیڈمی) اور ان کے رفقاء نے معہد کا ترانہ پڑھ کر سنایا۔

☆ پہلی نشست

افتتاحی نشست کے معاً بعد پہلی نشست منعقد ہوئی، یہ نشست محاضرات کے لئے خاص تھی، جن موضوعات پر محاضرات پیش کئے گئے وہ یہ ہیں: اکیسویں صدی کی ضروری مہارتیں، خاندانی معاملات میں کونسلنگ — اُصول اور طریقۂ کار، وطن عزیز کو پہچانئے، ان موضوعات پر علی الترتیب مولانا ساجد فلاحی، جناب کے امجد خان اور پروفیسر مسعود صاحب نے اپنے قیمتی محاضرات پیش کئے۔

مولانا ساجد فلاحی (فاضل معہد) نے کامیابی کے تکون اور دیگر ضروری مہارتوں پر معلومات افزاء روشنی

ڈالی، مولانا نے کہا کہ کسی بھی تنظیم یا ادارے میں کام کرنے کے لئے علوم اور مہارتوں میں کمی ہوتو برداشت کرلیا جائے گا؛ لیکن برتاؤ میں اگر کمی ہوتو برداشت نہیں کیا جائے گا، مولانا نے مزید کہا کہ اب زمانہ اتنا ترقی یافتہ ہوگیا ہے کہ بند کمرے میں رہ کر بھی بڑے سے بڑا جرم کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا اس وقت روحانیت کی طرف توجہ دینے اور اسے مضبوط کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

کے امجد خان نے فیملی کونسلنگ پر بات کرتے ہوئے طلاق کے دس اہم اسباب بتائے: ازدواجی خیانت، پیسہ، مواصلات کی کمی، دائمی بحث، موٹاپا، غیر حقیقت پسندانہ توقعات، قربت کی کمی، مساوات کا فقدان، شادی کے لئے تیار نہ ہونا، بدسلوکی وغیرہ، کے امجد خان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مسائل کو حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کا تجزیہ کیا جائے۔

پروفیسر مسعود صاحب نے ملکِ عزیز کے بارے میں بہت سی معلومات پیش کیں، مثلاً آبادی، تعلیم، تعلیمی وتجارتی ادارے، معاشی حالت وغیرہ مختلف اُمور کو اعداد وشمار کی روشنی میں سمجھایا۔

اس نشست کی نظامت کے فرائض مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی (استاذ معہد) نے انجام دیئے، نشست کا آغاز محی الدین سہیل مسعودی (طالب معہد) کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، بلال اعظمی (طالب معہد) نے کلیم عاجز مرحوم کا کلام پیش کیا۔

☆ دوسری نشست (۹رفروری) بعد نماز مغرب

اس نشست میں چار محاضرات پیش کئے گئے، محاضرات کے عناوین یہ ہیں: تعلیمی قیادت اور مؤثر طریقۂ تدریس، اسلامک فائنانس کی تعلیم مراکز اور مواقع، عوامی خطاب اور رابطہ عامہ، قرآن فہمی کورس، یہ محاضرات علی الترتیب مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی، مولانا ظفر عابدین ندوی، جناب محمد جواد حقانی اور مولانا محمد فرقان فلاحی نے پیش کئے۔

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی (صدر شعبۂ تحقیق) نے تعلیمی قیادت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قائد وہ نہیں ہے جو اپنے پیچھے پیروکاروں کی ایک بھیڑ چھوڑے؛ بلکہ قائد وہ ہے جو اپنے پیچھے قائدین کا ایک کارواں چھوڑے، مولانا نے کہا کہ قیادت کے لئے صف دوم ہمیشہ تیار رکھنی چاہئے، طریقۂ تدریس پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ تفکیری صلاحیت پروان چڑھے، اور طلبہ کی بھی تدریسی عمل میں شرکت ہو، استاذ مرکوز (Teacher Centred) طریقۂ تعلیم کے بجائے شاگرد مرکوز (Student Centred) طریقۂ تعلیم ہو۔

مولانا ظفر عابدین ندوی (شریعہ ایڈوائزر، دبئی اسلامک بینک) نے اسلامک بینکنگ کا تفصیلی تعارف کرایا، نیز اسلامک بینکنگ کے تعلیمی اداروں کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان اداروں میں داخلہ کے لئے رہنمائی کی، مولانا نے اسلامک فائنانس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک وسیع لفظ ہے، اس کے تحت اسلامک بینک، تکافل، صکوک وغیرہ سب آتے ہیں، اسلامک بینک اور روایتی بینک کے فرق کو بتاتے ہوئے اس مشہور اعتراض کو دور کیا کہ اسلامک بینک بھی وہی کرتے ہیں جو روایتی بینک کرتے ہیں۔

جناب جواد حقانی صاحب (کنسلٹنٹ ایم ایس ایجوکیشن اکیڈمی) نے PPT تیار کرنے کے تعلق سے مفصل گفتگو کی، حقانی صاحب نے PPT کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا، الفاظ کتنے ہوں؟ کلرنگ کس طرح کی جائے؟ کیسی تصویریں لگائی جائیں؟ فانٹ کا سائز کیا ہو؟ ہر بات کو واضح طور پر بیان کیا، نیز یہ بھی بتایا کہ PPT میں ڈائیگرام اور ٹیبل کا استعمال بات کو قریب الفہم بناتا ہے، خطاب کے اُصول وضوابط بھی مختصر مگر جامع انداز میں بیان کئے۔

مولانا فرقان فلاحی (فاضل معہد وریسرچ اسکالر انڈر اسٹینڈ قرآن اکیڈمی) جو شہر حیدرآباد میں واقع ''انڈر اسٹینڈ قرآن اکیڈمی'' کے نمائندہ تھے، نے اکیڈمی کے اس نصاب کا تعارف کرایا، جو اکیڈمی کی طرف سے قرآن مجید کو آسان انداز میں سمجھ کر پڑھنے کے مقصد سے بچوں اور بڑوں کے لئے مرتب کیا گیا ہے، جس کی رو سے قرآنی الفاظ کے معانی کو سمجھنا اور یاد رکھنا ممکن ہوتا ہے، مولانا نے بتایا کہ اس کورس میں بعض منتخب سورتوں کو مستند ترجمے کے ساتھ اور بنیادی عربی گرامر کو T.P.I (ٹوٹل فزیکل انسٹی ٹیوشن) کے ذریعہ سمجھایا جاتا ہے، مولانا نے حاضرین کے سامنے T.P.I کو عملی طور پر کرکے بھی بتایا۔

نشست کے اخیر میں حضرت الاستاذ مولانا رحمانی نے طریقۂ تدریس کے تعلق سے کچھ مفید اور کارآمد باتیں بتائیں، مولانا نے فرمایا کہ درس گاہ میں جانے سے پہلے مدرس کے لئے چار باتیں ضروری ہیں: کتاب کا مطالعہ کرنا، مطالعہ کے لئے مناسب کتاب کا انتخاب کرنا، درس کے مضامین کو ترتیب دینا، سبق سے متعلق قابلِ فہم مثالوں کو استحضار کرنا، مولانا نے مزید فرمایا کہ درس گاہ میں حاضر ہونے کے بعد سبق کے آغاز میں بطور تمہید کے سبق کا خلاصہ بتادیا جائے، سوالات کے ذریعہ سبق کا آغاز کیا جائے، سبق کے دوران طلبہ کو بھی تدریس کے عمل میں شریک کیا جائے، تدریس کے عمل میں شریک کرنے کے لئے ان سے تمرین کرائی جائے، تلخیص کرائی جائے، حلِ عبارت کے لئے عبارت تقسیم کردی جائے، عصری وسائل کا استعمال کیا جائے وغیرہ، سبق کے اختتام پر پڑھائے گئے سبق میں سے سوال کئے جائیں، خلاصہ پوچھا جائے، مولانا نے فرمایا کہ تدریس کے لئے جدید ٹکنالوجی کا بھی سہارا لینا چاہئے کہ اس سے بھی سبق کو سمجھانے میں بہت مدد ملتی ہے۔

نشست کا آغاز مولانا محمد ندوی (استاذ معہد) کی تلاوت سے ہوا، مولانا عزیر فلاحی (شعبۂ تحقیق) نے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی وہ مناجات پڑھ کر سنائی جو مولانا محترم نے حرم شریف میں ترتیب دی تھی، نظامت کی ذمہ داری مولانا احمد نور عینی (استاذ معہد) نے انجام دی۔

☆ تیسری نشست (۹ر بجے صبح ۱۰ر فروری)

اس نشست میں چار محاضرات پیش کئے گئے، جن کے عنوانات یوں تھے: قائدانہ صلاحیتیں، بحث وتحقیق — اُصول وضوابط، مقصد کی تعیین اور وقت کی تنظیم، مختصر مدتی عالم کورس — تعارف اور طریقۂ کار، ان موضوعات پر علی الترتیب جناب مرزا یاور بیگ صاحب، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صاحب، سید مصباح الدین صاحب اور مولانا سرفراز احمد قاسمی صاحب نے اپنے محاضرات پیش کئے۔

جناب مرزا یاور بیگ صاحب نے قائدانہ صلاحیتوں پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ مسلم قیادت کا برانڈ (مقبول عام شناخت) چار عناصر سے مرکب ہے: اللہ کی اطاعت، اللہ سے محبت، اُمت کی وحدت، اُمت کی نافعیت، بیگ صاحب نے مزید کہا کہ اللہ کی اطاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اللہ کی عظمت ہمارے دلوں میں نہ ہو، اسی طرح اللہ سے محبت اللہ کی کبریائی میں غور کرنے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر کا ادا کرنے سے پیدا ہوتی ہے، بیگ صاحب نے سیرت کے مطالعہ پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سیرت میں چاروں عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ڈاکٹر علیم اشرف جائسی (صدر شعبۂ عربی مانو) نے کہا کہ جو قومیں بحث وتحقیق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں، ترقی ان کے قدم چومتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے اعداد وشمار کے ذریعہ بتایا کہ اس وقت بحث وتحقیق کے لئے سب سے زیادہ خرچ کرنے والا ملک اسرائیل ہے، ڈاکٹر صاحب نے بحث علمی کی تعریف، اغراض، صفات باحث، صحیح علمی تفکیر کے وسائل اور فکری غلطیوں کے اسباب پر علمی وتحقیقی گفتگو کی، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کامیاب ریسرچ کے لئے موضوعیت، منہجیت اور منطقیت حد درجہ ضروری ہے، ڈاکٹر صاحب نے تحقیق مخطوطہ اور خطواتِ تحقیق پر مختصر مگر جامع کلام کیا۔

جناب سید مصباح الدین صاحب (ٹرسٹی ایم ایس ایجوکیشن اکیڈمی) نے کہا کہ کسی مقصد میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ تین باتیں بالکل واضح ہوں: ہدف، نظر، مشن (Vesion,Mission,Goal) اسی طرح انھوں نے کہا کہ مقصد میں کامیابی کے لئے SMART فارمولہ بھی بہت نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے، اسمارٹ فارمولہ اصل میں مخفف ہے ان پانچ الفاظ کا Attainable, Relevent, Time bound, Measure,Specific اس

فارمولہ کا مطلب یہ ہے کہ مقصد واضح اور منضبط ہو، مقصد کا صحیح اندازہ ہو، مقصد قابلِ حصول ہو، ہماری کوششوں سے مربوط ہو، مقصد تک پہنچنے کی انتہائی مدت متعین ہو، مصباح صاحب نے قیادت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ قیادت تقویٰ، حکمت اور خدمت سے مرکب ہے۔

مولانا سرفراز احمد قاسمی (منتظم مدرسہ عبداللہ ابن مسعودؓ) نے مختصر مدتی عالم کورس کا تعارف اور اس کے طریقۂ کار پر اپنے تجربات کی روشنی میں مبسوط اور مرتب گفتگو کی، مدرسہ عبداللہ ابن مسعود کے قیام کا پس منظر، اس کے مقاصد، اور اس کی خدمات وحصولیابیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی، مولانا نے کہا کہ یہ مدرسہ ان حضرات کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے جو کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے باضابطہ دین وشریعت کا علم حاصل نہیں کر سکے، مولانا نے بتایا کہ اس وقت تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ وطالبات اس مدرسہ سے حصول علم کی پیاس بجھا رہے ہیں، جن میں بڑی تعداد عصری تعلیم گاہوں کے طلبہ وفضلاء کی ہے، مولانا نے مزید کہا کہ یہاں سے فارغ ہونے والوں میں ڈاکٹرس بھی ہیں، انجینئر بھی ہیں، گریجویٹ بھی ہیں، لیکچررس بھی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے ادارے کا دوسرے علاقوں میں بھی تجربہ کیا جائے۔

نشست کے اخیر میں ناظم معہد حضرت مولانا رحمانی نے تربیت کے موضوع پر طلبہ وفضلاء کو گراں قدر نصیحت فرمائی، مولانا نے فرمایا کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی بے حد ضروری ہے، مولانا نے تربیت کی تین بنیادی قسمیں بتائیں: اخلاقی، علمی وفکری، پھر تینوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، مولانا نے بتایا کہ علمی تربیت میں مطالعہ کی ترغیب دینا، استنباط کی صلاحیت پیدا کرنا، زبان کی اصلاح کرنا شامل ہے، اسی طرح فکری تربیت میں موجودہ دور کے افکار کا شعور پیدا کرنا، سلگتے موضوعات پر مذکرات کرانا، الحادی افکار کا جواب دینا شامل ہے۔

نشست کا آغاز مولوی عزیر فلاحی کی تلاوت سے ہوا، مولانا خالد ندوی نے کلام اقبال پڑھ کر سنایا، مولانا اعظم ندوی (استاذ معہد) نے ناظم جلسہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری نبھائی۔

☆ چوتھی نشست (بعد نماز عصر ۱۰ر فروری)

یہ ایک خصوصی نشست تھی جو تأثرات اور توصیفی اسناد پیش کرنے کے لئے منعقد ہوئی، اس نشست میں مختلف میدانوں میں نمایاں کام کرنے والے فضلاء معہد کی تکریم کی گئی، اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے اعتراف خدمات کے طور پر توصیفی سند اور نشان امتیاز (مومنٹو) سے سرفراز کیا گیا، اسی طرح معہد کے دو قدیم اور صف اول کے اساتذہ مفتی اشرف علی قاسمی اور مفتی شاہد علی قاسمی کو ان کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں مومنٹو پیش کیا گیا، بعض فضلاء نے اس موقع پر اپنے قلبی احساسات وتأثرات کا بھی اظہار کیا، اصل میں یہ نشست اختتامی نشست تھی

اور بعد مغرب ہونا طے تھی؛ مگر بعض فضلاء کی رات میں روانگی کے پیش نظر نشست بعد عصر منعقد کی گئی ،نشست کی کارروائی خود حضرت مولانا رحمانی نے چلائی ،نشست کا آغاز طلحہ (طالب معہد) کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔

☆ اختتامی نشست (بعد مغرب ۱۰؍فروری)

اس نشست میں تین محاضرات پیش کئے گئے ،جن کے عناوین یہ ہیں: عربی زبان میں تدریس،عوامی درس قرآن ،مسائل شرعیہ کی رہنمائی ، یہ تینوں محاضرات معہد کے مؤقر اساتذہ نے پیش کئے ،جن کے نام علی الترتیب یوں ہیں: مولانا اعظم ندوی،مولانا اشرف علی قاسمی،مولانا شاہد علی قاسمی۔

مولانا اعظم ندوی (صدر شعبۂ ثقافت) نے زبان کی مہارتوں اور عربی بول چال کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کے بارے مین فنی اور تجرباتی گفتگو کی ،مولانا نے ان اسالیب کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا،جن سے عربی میں بات چیت کرنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے،مثلاً: عربی میں سوال کر کے جواب طلب کیا جائے ،حوار کرایا جائے ،اسی طرح سے طلبہ کے درمیان آپس میں کسی موضوع پر مناقشہ کرایا جائے ،مولانا نے بتایا کہ تصاویر پیش کر کے ان پر جملے بنوانا اور قصہ بیان کرانا بھی اس سلسلہ میں ثمر آور ہے،اسی طرح سے ایک جملہ بنا کر اسی نوعیت کے جملے بنوانا (جسے النسج علی المنوال کہتے ہیں) بہت مفید ثابت ہوتا ہے،مولانا نے مزید کہا کہ عربی زبان میں مہارت کے لئے براہِ راست عربی زبان میں سوچنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا اشرف علی قاسمی (ناظم مالیات) نے کہا کہ عوامی درس قرآن دعوتی وتذکیری نوعیت کا ہونا چاہئے ، مولانا نے کہا کہ عوامی درسِ قرآن میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا جائے کہ صحیح عقیدے کی ترجمانی مثبت انداز میں ہو،ایمانیات ونواقض ایمان کی وضاحت ہو،علمی واصطلاحی باوں سے گریز کیا جائے ،راجح قول ذکر کیا جائے ،ملحدانہ ومشرکانہ عقائد واعمال کی تردید ہو،آیات سے مستنبط ومربوط مسائل کا ذکر ہو،حالات حاضرہ پر آیات کا انطباق کیا جائے ،موضوع کو حلقۂ درس میں ہی مکمل کر دیا جائے ،تذکیری ودعوتی آیات کا انتخاب کیا جائے ،مولانا نے مطالعہ کے لئے تفسیر کی چند نمایاں کتابوں کی طرف بھی رہنمائی کی۔

مفتی شاہد علی قاسمی (ناظم تعلیمات) نے مسائل شرعیہ کی رہنمائی کے سلسلہ میں چند اُصولی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مفتی زمانہ شناس ہو،صورتِ مسئولہ سے بخوبی واقف ہو (خاص کر نئے مسائل میں)،فتویٰ دینے میں عجلت نہ کرے، کسی فرد یا کمپنی کے نام کی صراحت کے ساتھ فتویٰ نہ دے؛ بلکہ فتویٰ میں عموم کو پیش نظر رکھے،جس مسئلہ میں فتویٰ کا غلط استعمال ہوسکتا ہو،اس کے جواب سے گریز کی کوشش کرے،طلاق اور میراث کے مسائل کا جواب فون پر نہ دے، جواب پر اطمینان قلب حاصل ہونے کے بعد ہی فتویٰ دے،نصوص سے اعتناء

کرے، اعتدال ومیانہ روی اختیار کرے، سہل وآسان اُسلوب میں جواب دے، مجتہدین کی رائے کا احترام کرے، اگر کوئی معاملہ ناجائز ہوتو متبادل کی رہنمائی کرے۔

اخیر میں حضرت الاستاذ مولانا رحمانی نے ان تینوں محاضرات سے متعلق بہت قیمتی باتیں حاضرین کے گوش گزار فرمائیں۔

اس نشست میں مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے رابطہ تلامیذ رحمانی نامی تنظیم کی تشکیل کا باضابطہ اعلان کیا اور ساتھ میں یہ بھی اعلان کیا کہ ان شاء اللہ اس تنظیم کی جانب سے مولانا رحمانی کی شخصیت پر ایک سال کے اندر ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد عمل میں آئے گا۔

نشست کا آغاز ابوطلحہ (طالب معہد) کی تلاوت سے ہوا، مولانا ناظر انور قاسمی (استاذ معہد) نے نظامت کے فرائض انجام دیئے، حضرت الاستاذ مولانا رحمانی کی نصیحت ودُعاء پر اس اختتامی نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

☆ شعری نشست (بعد عشاء ۱۰ر فروری)

معہد اپنے طلبہ وفضلاء کے اندر جہاں فقہ وفتاویٰ کی صلاحیت پروان چڑھاتا ہے، وہیں ان کے اندر زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق بھی پیدا کرنا چاہتا ہے؛ چنانچہ معہد میں مختلف مناسبتوں سے ادبی وشعری نشست منعقد ہوتی رہتی ہے؛ لہٰذا اس دوروزہ پروگرام سے فائدہ اُٹھا کر اختتامی نشست کے بعد ایک شعری نشست کا انعقاد عمل میں لایا گیا، جس میں شرکاء اور معہد کے اساتذہ وطلبہ نے استاذ شعراء کے معیاری کلام پیش کئے، معہد کے اساتذہ میں مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی، مفتی شاہد علی قاسمی، مولانا اعظم ندوی، مولانا نوشاد اختر ندوی اور مولانا احمد نور عینی نے مستند شعراء کے معیاری اشعار پڑھ کر سنائے، جن شعراء کے اشعار پڑھے گئے ان میں علامہ اقبال، مرزا غالب، میر تقی میر، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر کلیم احمد عاجز قابل ذکر ہیں۔

اس شعری نشست کی نظامت کے فرائض مولوی حبیب الرحمٰن خان ندوی (ریسرچ اسکالر شعبۂ قیادت) نے انجام دیئے۔

• • •

سفرنامۂ بیت المقدس

خالد سیف اللہ رحمانی

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ (اللہ تعالیٰ ہر طرح کے شرور سے دونوں مقامات کی حفاظت فرمائے) کے بعد مسلمانوں کا تیسرا سب سے زیادہ قابل احترام مقام بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ ہے، یہ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے، مکہ مکرمہ کی تیرہ سالہ زندگی میں بھی آپ ﷺ نے اس کو قبلہ کی حیثیت دی اور اس طرح نماز ادا کرنے کا اہتمام فرمایا کہ کعبۃ اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑیں، پھر جب آپ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو مکۃ المکرمہ اور مسجد اقصیٰ کے دو مخالف سمتوں میں ہونے کی وجہ سے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ دونوں کا استعمال ہو؛ چنانچہ سولہ سترہ ماہ تک آپ ﷺ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا اور مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبلہ کی تبدیلی کا حکم آ گیا، اور مدینہ کی ایک مسجد میں نماز کے درمیان ہی مسلمانوں کو قبلہ تبدیل کرنا پڑا، جس کی یادگار ''مسجد القبلتین'' ابھی بھی مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

مسجد اقصیٰ کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ کعبۃ اللہ کے بعد وہ دنیا کی اولین مسجد ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول زمین میں سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد حرام، میں نے عرض کیا: اس کے بعد؟ ارشاد ہوا: مسجد اقصیٰ، میں نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فرق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چالیس سال، (مسلم، حدیث نمبر: ۵۲۰) جن تین مسجدوں کے لئے آپ نے خاص طور پر سفر کی اجازت دی، ان میں ایک مسجد اقصیٰ ہے، جو بیت المقدس میں واقع ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۱۸۹) حضرت میمونہ بنت سعدؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: یہی حشر ونشر کی زمین ہوگی، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۶۲۶) جہاں آپ ﷺ نے مسجد حرام (مکہ مکرمہ) اور مسجد نبوی (مدینہ منورہ) میں نماز پر خصوصی اجر کا ذکر فرمایا، اسی طرح مسجد اقصیٰ میں بھی نماز ادا کرنے کو خصوصی اجر کا باعث قرار دیا کہ ایک نماز ادا کرنے پر پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۴۲۴) اور بعض روایتوں میں اس سے زیادہ کا بھی ذکر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انھوں نے تین دُعائیں فرمائیں، جن میں سے تیسری دُعاء یہ تھی کہ جو شخص بھی اس مسجد میں نماز کے ارادہ سے آئے، جب وہ نماز پڑھ کر یہاں سے باہر نکلے تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہوجائے، جیسے آج ہی وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، اور آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اُمید ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دُعاء بھی قبول ہوئی ہوگی، (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۴۰۸) مسلمانوں کے لئے اس مسجد کی فضیلت کا ایک خصوصی پہلو یہ بھی ہے کہ شب معراج کے موقع سے رسول اللہ ﷺ نے یہاں تمام انبیاء کرام کی امامت فرمائی، اور یہیں سے آپ ﷺ کا سفر آسمانی شروع ہوا۔

آپ نے شہر بیت المقدس میں مقیم ہونے کی بھی فضیلت بیان فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بیت المقدس سے اتنا قریب رہتا ہو کہ وہاں سے مسجد نظر آتی ہو، تو یہ جگہ اس کے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، غرض کہ مسجد اقصیٰ کی ڈھیر ساری فضیلتیں منقول ہیں، اور خود قرآن مجید نے بھی متعدد مواقع پر کہا ہے کہ ہم نے اس کے گرد و پیش برکتیں رکھی ہیں، (بنی اسرائیل: ۱، اعراف: ۱۳۷، انبیاء: ۷۱، ۸۱، سبا: ۱۸) یہ برکت روحانی بھی ہے اور مادی بھی، روحانی برکت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء کرام اسی خطہ میں آسودۂ خواب ہیں، اور مادی برکتوں میں سے ایک اہم چیز خوشگوار موسم اور زیتون کے ہرے بھرے باغات ہیں، قرآن مجید نے فلسطین کو ''مقدس سرزمین'' بھی قرار دیا ہے، (مائدہ: ۱۲) اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سرزمین میں میدان حشر قائم ہوگا، ان نسبتوں کی وجہ سے عرصہ سے دل میں آرزو کروٹ لیتی تھی کہ کبھی بیت المقدس میں حاضری کا شرف حاصل ہوجائے۔

اصحابِ کہف کی بستی میں

کبھی انسان کی تمنا خواب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے؛ چنانچہ 1990-91ء کی بات ہے کہ میں رمضان المبارک میں والدہ اور اہلیہ کے ساتھ اس نیت سے سعودی عرب گیا کہ عمرہ کرنے کے بعد حج تک کا وقت جدہ میں گزار لیں اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ہندوستان واپس ہوجائیں، اس زمانہ میں یاسر عرفات اور اسرائیلی حکومت کے درمیان گفتگو جاری تھی، اس وقت کی اسرائیلی حکومت بہ مقابلہ موجودہ حکومت کے نسبتاً بہتر تھی، اور بظاہر صلح پسند معلوم ہوتی تھی، کچھ اس انداز کی بات چل رہی تھی کہ بیت المقدس اسرائیلی اور فلسطینی دونوں مملکتوں کی راجدھانی ہو اور اس کا انتظام دونوں مشترکہ طور پر سنبھالیں، دل میں خیال آتا تھا کہ جیسے پہلے مسلمانوں کو بیت المقدس کے سفر کی سہولت تھی اور بہت سے لوگ حرمین شریفین کی زیارت سے فارغ ہوکر اس تیسرے حرم کی بھی زیارت کیا کرتے تھے، شاید اب پھر اس کا راستہ کھل جائے، اس اُمید سے دل کو غیر معمولی مسرت تھی اور قبلۂ اول کی

زیارت کی آرزو سینہ میں چٹکی لے رہی تھی کہ اسی دوران خواب میں دیکھا کہ گویا میں بیت المقدس گیا ہوں اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھ رہا ہوں، اس خواب نے شررِ تمنا کو شعلہ بنا دیا اور گمان ہوا کہ شاید مستقبل قریب میں اللہ کی طرف سے اس خواب کی تعبیر ظاہر ہو؛ لیکن اس انتظار میں سالہا سال گزر گئے۔

میرے لڑکے محمد ظفر عابدین ندوی سلمہ (دبئی اسلامک بینک) کے یہاں جانے کا موقعہ ملا، تو ان کے ایک دوست جناب محمد نعیم صاحب سے ملاقات ہوئی، جن کی تجارت اُردن میں بھی تھی، ان سے معلوم ہوا کہ لوگ اُردن سے بذریعہ روڈ فلسطین جاتے ہیں، اور اسرائیل کی طرف سے اجازت کا پروانہ ملتا ہے؛ چنانچہ اسی اُمید پر اُن کے مشورے سے ٹکٹ بھی بنوالیا؛ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ان کی معلومات ناقص تھیں، اصل میں انفرادی طور پر اسرائیل وہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا؛ بلکہ گروپ کی شکل میں اجازت دی جاتی ہے؛ چنانچہ اب گروپ کی تلاش شروع ہوئی اور حیدرآباد کے ایک ٹور گروپ Adventure Tours & Travels کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ گروپ لے کر مسجد اقصیٰ جاتے ہیں، اس گروپ کے ذمہ دار جناب عبدالرشید صاحب ہیں، اور ان کے معاون خاص ان کے بڑے بھائی جناب عبدالوحید صاحب، آخر نظامِ سفر میں بار بار کی تبدیلی کے بعد ۴؍جنوری ۲۰۱۹ء کو جناب عبدالوحید صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کا گروپ روانہ ہوا، عبدالوحید صاحب ماشاءاللہ نرم خو، بُردبار، مزاج شناس اور منتظم آدمی ہیں، انھوں نے اپنی طاقت بھر شرکاءِ سفر کو سہولت پہنچانے کی بھرپور کوشش کی، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، تاریخ کی تبدیلی کی وجہ سے قافلہ میں لوگ بھی گھٹتے بڑھتے رہے؛ لیکن آخر میں ۲۴؍افراد رہ گئے، اس گروپ کی اہم بات یہ تھی کہ اس میں مختلف مسالک اور تنظیموں کے لوگ جمع تھے، اور تعلیم، سیاست اور تجارت سے مربوط ذمہ دار شخصیتیں شامل تھیں، کئی اعلیٰ تعلیم یافتہ ریٹائرڈ گورمنٹ ملازمین بھی تھے، متعدد حضرات اہل خانہ کے ساتھ شریک سفر تھے، اور سبھی حضرات سنجیدہ، مہذب اور ایک دوسرے کی رعایت کرنے والے تھے، خاص کر جو نوجوان تھے وہ خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے۔

بہر حال ہم لوگ سعودی ایئر لائنز کے ذریعہ تقریباً ایک بجے دن حیدرآباد سے نکلے اور جدہ میں مختصر وقفہ کے ساتھ ساڑھے نو بجے شب اُردن کی راجدھانی عمان کے ایئر پورٹ پر پہنچے، یہ ایئر پورٹ اگرچہ بہت بڑا نہیں ہے؛ لیکن چھوٹا بھی نہیں ہے، جب ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچے تو سارے لوگ ٹھنڈک سے کانپ رہے تھے، اور ٹھنڈک کی جتنی بھی چیزیں میسر تھیں، لوگوں نے وہ سب پہن رکھی تھیں، جیکٹ، سوئیٹر، اِنر، گرم پائجامہ، گرم موزے، دستانے اور سر پر گرم ٹوپی یا رومال، موسم کی خنکی کے ساتھ سرد ہوائیں لوگوں کی قوت برداشت کا امتحان لے رہی تھیں، اُردن ایئر پورٹ کا عملہ بہت شریف اور خوش اخلاق ہے؛ چنانچہ ہم لوگوں کو باہر نکلنے میں دیر نہ لگی اور چالیس پینتالیس

منٹ میں سب لوگ باہر آ گئے، ہمارے ٹور آپریٹر نے وہاں کے مقامی ٹور آپریٹر سے اپنا رابطہ قائم کرلیا تھا، اور وہی پورے گروپ کے لئے گائیڈ، ٹرانسپورٹ، رہائش اور کھانے کا ذمہ دار تھا، جیسے ہی ہم لوگ باہر نکلے، آرام دہ لگژری بس کے ساتھ میزبان کے نمائندہ باہر موجود تھے، ہم لوگ بس میں سوار ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کر کے اس ہوٹل میں پہنچے، جہاں ہمارا قیام تھا، یہ ہوٹل شہر کے قدیم علاقہ میں واقع ہے، جب ہم لوگ پہنچے تو کھانا آخری مرحلہ میں تھا؛ چنانچہ عبدالوحید صاحب کے حسبِ ہدایت کمروں میں جانے کے بجائے ہم لوگ سیدھے ریسٹورنٹ میں گئے اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں منتقل ہو گئے، بحیثیت مجموعی سفر تقریباً بارہ گھنٹے کا ہو چکا تھا، اور بہت سے لوگوں کو گزشتہ رات بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا، بعض حضرات کریم نگر اور اضلاع سے آئے تھے، ان لوگوں نے ۲۴ ر گھنٹے سے آرام نہیں کیا تھا؛ اس لئے جلد ہی تمام لوگ گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے، جہاں ایک طرف تکان کا شدت سے احساس تھا، وہیں غیر معمولی خوشی و مسرت بھی تھی کہ اس وقت ہم لوگ سرزمین شام میں ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جس کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور جو عہد نبوی میں موجودہ شام، اُردن، لبنان، اسرائیل اور فلسطین پر مشتمل تھا۔

پروگرام کے مطابق : ۵ رجنوری کو ہم لوگ صبح ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر بس پر سوار ہوئے، یہاں ہمارے گائیڈ شیخ ہشام تھے، یہ ادھیڑ عمر کے تھے، قرآن مجید بہت اچھا پڑھتے تھے؛ البتہ تھے ہندوستان کی فلمی دنیا کے عاشقوں میں، ہماری پہلی منزل وہ چرچ تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک ماہ یا ۴۰ ر دن کا وقت گزارا تھا، گویا اعتکاف کیا تھا، یہ بڑا سا چرچ ہے جو عیسائی وقف کے زیر انتظام ہے، اس چرچ میں پینٹنگ کے ذریعہ تورات میں مذکور بعض واقعات کو ظاہر کیا گیا ہے، جیسے: حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرورش وغیرہ، یہ چرچ ایک پہاڑی پر واقع ہے، چرچ کے باہر ایک لمبا سا عصا اور اس میں لپٹا ہوا سانپ دکھایا گیا ہے، اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات — عصا اور سانپ — کی طرف اشارہ ہے، اس پہاڑ کی چوٹی سے دریائے اُردن اور بحر مُردار تک کا علاقہ نظر آتا ہے، لوگوں نے بتایا کہ جب موسم صاف ہوتا ہے تو قبۃ الصخرۃ (سنہرا گنبد) بھی نظر آتا ہے، یہودیوں کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس پہاڑی پر تشریف لائے تھے، انھوں نے یہاں مختصر قیام کیا تھا، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا تھا کہ خدا کی طرف سے کون سی سرزمین اُن کو عطا کی گئی ہے، اس روایت کی بنیاد پر یہود فلسطین، موجودہ اسرائیل اور اُردن کے بڑے حصہ کو ارض بنی اسرائیل قرار دیتے ہیں، اس پہاڑی سے خاصے فاصلہ پر پانی کے چند چشمے نظر آتے ہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہی وہ چشمے ہیں جو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کے لاٹھی مارنے پر نکل آئے تھے، تاہم یہ حصہ صحراء سینا سے کافی دُور ہے، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کی دُعاء کی تھی، یہ تمام واقعات جو اس خوبصورت اور بلند پہاڑی کی طرف منسوب ہیں، اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں، قرآن وحدیث میں ان کا تذکرہ نہیں آیا ہے، اس پہاڑ کا نام ''جبل موسیٰ'' ہے۔

یہاں سے ہم لوگ بالکل مخالف سمت میں چلے اور ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر طے کرکے اس میدان سے گزرے، جو ''موتہ'' کہلاتا ہے، یہ ایک مقام کا نام ہے، جہاں جمادی الاخریٰ ۸ھ میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی، اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے مختلف روسائے مملکت کو قبول اسلام کے لئے دعوتی مکتوب بھیجے؛ چنانچہ حارث بن عمیر ازدیؓ کو شام کے مقام بُصریٰ کے فرمارواکے پاس بھیجا، جب یہ موتہ کے پاس پہنچے تو قیصر روم کے ایک گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی نے انھیں قتل کردیا؛ حالاں کہ اُس وقت روم کی طاقت سے مسلمانوں کی کوئی نسبت نہیں تھی؛ لیکن یہ بات ضروری سمجھی گئی کہ غسانی کے خلاف فوجی کارروائی کی جائے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج وہاں کے لئے روانہ کی اور حضرت زید بن حارثہؓ کو فوج کا امیر مقرر فرمایا، نیز یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر زید بن حارثہ شہید ہوجائیں تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کمان سنبھالیں، اور اگر ان کی بھی شہادت ہوجائے تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ امیر لشکر ہوں گے، اور اگر یہ بھی شہید ہوجائیں تو پھر جس پر مسلمانوں کا اتفاق ہوجائے، وہ امیر ہوگا، اس مختصر فوج کے مدمقابل رومیوں کا لشکر جرار تھا، جو ایک لاکھ فوجیوں پر مشتمل تھا، مسلمانوں نے بہت ہی حوصلہ وہمت سے کام لیا؛ لیکن تعداد میں غیر معمولی فرق تھا؛ اس لئے یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے مقرر کئے ہوئے تینوں اُمرائے لشکر شہید ہوگئے، پھر حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنے ہاتھ میں کمان لی اور اپنی ذہانت، بہادری اور صلاحیت کے ذریعہ مسلمانوں کی فوج کو کسی نقصان کے بغیر باہر نکال لائے، یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۸ھ میں پیش آیا۔

ہم لوگ میدان موتہ (جہاں جہاد کا واقعہ پیش آیا تھا) سے گزرتے ہوئے ان تینوں شہداء کے مزار پر حاضر ہوئے، حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے مزارات ایک ہی جگہ پر واقع ہیں، اور وہاں ان صحابہ کی قبر کے ساتھ بڑی عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی ہے، جس میں وضوء اور استنجاء وغیرہ کی تمام سہولتیں حاصل ہیں، اور زائرین کی آمد ہوتی رہتی ہے؛ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان قبروں پر سجدہ نہیں کیا جاتا، نہ حاجت مندوں کی چٹھیاں لگائی ہوئی ہیں، جیسا کہ ہندوستان میں بزرگوں کے مزارات پر ہوا کرتا ہے، اس مسجد کی عمارت کی تجدید کا کام ۵۸۳ھ میں ہوا، یہاں سے کچھ فاصلہ پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی قبر ہے، وہاں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی صحابہ کی قبروں کی زیارت کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ عہد نبوی ﷺ میں پہنچ گیا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے رفقائے عالی مقام کی قربانیوں سے دل بھر آتا ہے۔

آج کے نظام میں اصحاب کہف کے غار کو دیکھنا بھی شامل تھا؛لیکن اس مقام پر پہنچتے پہنچتے جس کو اصحاب کہف کی خواب گاہ قرار دیا جاتا ہے،عشاء کا وقت ہو چکا تھا،اصحابِ کہف کے غار پر آج کل ایک دروازہ لگا ہوا ہے، جو پانچ بجے شام میں بند کر دیا جاتا ہے، جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو دروازہ بند ہو چکا تھا، پہرہ دار سے گزارش کی گئی اوراس نے ان صاحب کو خبر کی ،جن کے پاس کنجی ہوتی ہے، اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ وہ ہم لوگوں کے مسافر ہونے کا خیال کرتے ہوئے آئے اور قفل کھولا ، غار کے اندر بھی لائٹ لگی ہوئی ہے، ہم سب لوگ اندر گئے، غار کے اندر چار قبریں موجود ہیں، بقیہ تین قبریں نہ معلوم سطح زمین کے اندر ہیں یا شہر کے کسی اور حصہ میں،قرآن مجید میں جو تفصیل بتائی گئی ہے کہ سورج کا نکلنے اورڈوبنے کے وقت کچھ اس طرح گزرہوتا تھا کہ دھوپ اندر نہیں آتی تھی، غار کے سامنے کا دروازہ اور پیچھے کی طرف کا ایک کھلا ہوا حصہ اسی انداز کا ہے،ایک قبر میں اوپر کے حصہ میں چھوٹا سا سوراخ ہے، کہا جاتا ہے کہ اس سے انسانی ہڈیاں نظر آتی ہیں، ہمارے بعض ساتھیوں نے بھی موبائل کا ٹارچ روشن کر کے دیکھنے میں کامیابی حاصل کی ، یہاں دُعاء کا اہتمام کیا گیا اور اصحابِ کہف کے واقعہ کو مختصر طور پر شرکاء کے سامنے پیش کیا گیا۔

قرآن نے نہ صرف اس واقعہ کا ذکر کیا ہے؛ بلکہ سورہ :۱۸ ہی اسی نام سے ہے، واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ روم کا بادشاہ دقیانوس ایک بُت پرست بادشاہ تھا اور وہ کسی مسلمان کے زندہ رہنے کا روادار نہیں تھا؛ چنانچہ راجح قول کے مطابق سات مسلمان نوجوان اپنا ایمان بچانے کے لئے آبادی سے بھاگ نکلے،اور طرسوس نامی جگہ کے قریب ایک غار میں جا چھپے،اللہ تعالیٰ نے اُن پر نیند مسلط کر دی اور وہ تقریباً تین سو سال گہری نیند سوتے رہے، پھر جب آنکھ کھلی تو انھیں ایسا لگا کہ گویا صرف ایک آدھ دن سوئے ہیں ، انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو شہر بھیجا کہ کھانے کی چیزیں لے کر آئے ، جب وہ شہر گئے تو سکہ دیکھ کر لوگوں کو اندازہ ہوا کہ یہ سینکڑوں سال پہلے کا سکہ ہے،اور پھر یہ راز کھلا ،اس وقت اہل ایمان کی حکومت قائم ہو چکی تھی ، یہ اپنے غار واپس آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دے دی، پھر لوگوں نے اس غار پر ایک مسجد تعمیر کر دی ، (کہف:۲۱) اب وہ مسجد باقی نہیں ہے ؛لیکن اس سے متصل ایک بہت بڑی مسجد تعمیر کی گئی ہے ، جو تمام سہولتوں سے آراستہ ہے ، اس طرح اصحابِ کہف کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ؛ اگرچہ اصحاب کہف کے مقام کے سلسلہ میں مفسرین اور جغرافیائی ماہرین کی رائیں مختلف ہیں ؛لیکن قرائن کی روشنی میں بظاہر یہی مقام اصحابِ کہف کا معلوم ہوتا ہے،اصحابِ کہف کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے عبرت ہے کہ صاحب ایمان کو مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنے ایمان کی حفاظت کرنی چاہئے اور جب ایک مسلمان ثابت قدمی اختیار کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے غیبی مدد کا دروازہ کھلتا ہے۔

ہم لوگ رات گئے اپنے ہوٹل واپس آئے ،اور دیر تک وہی مقامات دماغ پر چھائے رہے، جہاں آج جانے کا

موقع ملا تھا، آئندہ دن ہمیں فلسطین یعنی موجودہ غاصب اسرائیل کی طرف جانا تھا؛ چنانچہ صبح کو ہم لوگ اسی تیاری کے ساتھ نکلے، جاتے ہوئے عمان سے باہر ایک اور شہر میں پہنچے، اور کئی چڑھائیوں کو عبور کرتے ہوئے نسبتاً ایک اونچے پہاڑ پر آ کر رُکے، یہاں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قبر ہے، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پوتے تھے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص تھے، اور ایسے ہی جاں نثار تھے جیسے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد انھیں نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا، قرآن مجید میں بھی دو مواقع پر ان کا ذکر خیر آیا ہے، (کہف:۶۱، بقرہ:۲۴۶) اور حدیث میں ان کے ایک معجزہ کا ذکر آیا ہے کہ انھوں نے جمعہ کے دن مشرکین کی کسی آبادی کا محاصرہ کرلیا تھا، تورات کی تعلیم کے مطابق ہفتہ کے دن جہاد کی ممانعت تھی؛ اس لئے انھوں نے دُعاء فرمائی کہ جب تک فتح حاصل نہ ہو جائے سورج غروب نہ ہو، اور معجزاتی طور پر ان کے حق میں یہ بات پوری ہوئی۔ (صحیح بخاری، باب من أحب النباء قبل الغزو، حدیث نمبر: ۳۱۲۴، صحیح مسلم، باب تحلیل الغنائم لهذه الأمة خاصة، حدیث نمبر: ۱۷۴۷، فتح الباری: ۲۲۱/۶)

حضرت یوشع علیہ السلام کے نام سے جو قبر پائی جاتی ہے، وہ کافی طویل تقریباً ۱۲ر گز کے آس پاس ہے، اور اس پر سبز چادر بچھادی گئی ہے، یہاں پر حضرت یوشع علیہ السلام کے نام سے ایک مسجد بھی ہے، یہاں کا منظر بھی بڑا پُر کیف ہے، سرسبز و شاداب پہاڑی، اونچی نیچی عمارتیں، نشیب و فراز میں بَل کھاتی سڑکیں اور نیچے ہرے بھرے زیتون کے خوبصورت باغات، گویا دل کے سرور کے ساتھ آنکھوں کے سرور کا سامان بھی مہیا ہے۔

اسی دن ہم لوگوں کا گذر ''اَغوار'' نامی جگہ سے ہوا، جہاں دو جلیل القدر صحابہ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح اور حضرت ضرارؓ بن اَزوَر کی قبریں ہیں، حضرت ابوعبیدہؓ کو خود بارگاہ نبوی سے ''امین اُمت'' کا خطاب ملا تھا، اور ان کے مرتبہ و مقام کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے لئے جن حضرات کا نام پیش کیا گیا، ان میں ایک نام اُن کا بھی تھا، عہد صدیقی میں آپ ہی لشکر شام کے امیر بنائے گئے، اور عہد فاروقی میں شام کے گورنر مقرر ہوئے، حضرت ابوعبیدہؓ ہی کے ہاتھوں سلطنت روم مسلمانوں کے زیر اقتدار آئی، جو اُس وقت دنیا کی سُپر طاقت تھی؛ لیکن خود حضرت ابوعبیدہؓ کے زہد و فقر کا حال یہ تھا کہ حضرت عمرؓ جیسے درویش صفت فرماں روا کی آنکھیں بھی ان کی حالت دیکھ کر نم ہوگئیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ کے بعد حضرت ضرارؓ کی قبر پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، شام کی فتوحات میں ان کی شجاعت و بہادری کا نمایاں حصہ ہے، اس میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں شہید ہوئے؟ لیکن ایک روایت کے مطابق حضرت ضرار غزوۂ یرموک میں شامل تھے اور ان کا انتقال دمشق میں ہوا، اس وقت چوں کہ یہ پورا خطہ شام ہی کا حصہ تھا؛ اس لئے یہاں اُن کی قبر کا ہونا مستبعد نہیں، بہر حال یہاں بھی فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ان مقامات سے گزرتے ہوئے ہم لوگ سرحد پر پہنچے اور وہاں سے فلسطین میں داخل ہوئے۔

یہ بات بہت محسوس ہوئی کہ اُردن اور اس کی راجدھانی عمان شہری ترقی، صفائی ستھرائی، کشادہ سڑکوں اورخوبصورت مسجدوں کے اعتبار سے تو ہے ہی بہتر، اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگ بھی نرم خو، خوش گفتار اور محبت کرنے والے ہیں، مسافروں اور مہمانوں کے ساتھ عزت اور سلیقے سے پیش آتے ہیں، دینی کیفیت بہتر ہے، مسجدیں آباد ہیں، نمازوں کے بعد مسجد کے مائک سے قرأت قرآن مجید کا بھی رواج ہے، اور نوجوانوں کے چہرہ پر کثرت سے داڑھیاں بھی ہیں؛ البتہ مغربی سیاح بکثرت آتے ہیں اور ان کی آمد کی وجہ سے جو اثر پڑتا ہے، وہ ظاہر ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ اُردن میں بھی اور مصر میں بھی مقامی سیاح نے ہندوستان سے بڑی محبت کا اظہار کیا، اور اس کا سبب بتایا کہ شاہ رُخ خان، سلمان خان اور امیتابھ بچن کا تعلق ہندوستان سے ہے، وہ خاص کر شاہ رُخ خان کا بار بار تذکرہ کرتا تھا، اس سے ان کی فکری پستی اور ثقافتی اعتبار سے منفی تبدیلیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو ایک سمندری سونامی کی طرح عالم عرب پر حملہ آور ہے۔

ارضِ فلسطین میں

بہر حال ہم لوگ دوپہر کو اسرائیل کے بارڈر پہنچے، جو ''اریحہ'' نامی شہر میں واقع ہے، جس کو تورات میں ''جریکو'' کا نام دیا گیا ہے، اور آج کل وہ اسی نام سے مشہور ہے، پہلے سے گائیڈ نے بتایا تھا کہ اسرائیلی بارڈر پر بہت پوچھ گچھ ہوتی ہے، اور پریشان کیا جاتا ہے؛ چنانچہ اس کا عملی تجربہ ہوگیا، پہلے تو سبھوں کی تلاشی لی گئی، پھر سامان ایک اسکرین مشین میں ڈالا گیا، جو ایئرپورٹ کی عام مشینوں سے کافی مختلف اور کافی بڑی تھی، پاسپورٹ کی پوری تفصیلات پہلے ہی منگوالی گئی تھیں؛ لیکن پھر بھی گہرائی کے ساتھ تفتیش شروع ہوئی، تفتیش کے دوران ۱۴؍لوگوں کو تو پاسپورٹ دے دیا گیا اور وہ باہر آ گئے؛ لیکن دس افراد روک لئے گئے اور ان سے مزید تفتیش کی گئی، ان سے جو سوالات کئے گئے، ان میں یہ بھی تھا کہ کیا آپ نے پاکستان کا سفر کیا ہے؟ یا کہیں آپ کی شادی پاکستان میں تو نہیں ہوئی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، اسرائیلی سیکوریٹی کا ایک خاص طرز عمل یہ تھا کہ انھوں نے لوگوں کو بٹھا لیا اور مسلسل ان کی حرکات وسکنات پر نظر جمائے رہے، تقریباً چار پانچ گھنٹے ان حضرات کو اسی طرح بٹھائے رکھا، اور میرے بشمول بقیہ چودہ حضرات ایمیگریشن سے باہر بے چینی کے ساتھ وقت گزارتے رہے، کبھی کھڑے ہو کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی چلتے ہوئے، ٹھنڈک اور اس کے ساتھ تیز ہوا کی وجہ سے سارے لوگ پریشان تھے، چار پانچ گھنٹے گزار کر تمام روکے ہوئے لوگوں کو جانے کی اجازت ملی، بظاہر اس کا مقصد آنے والوں کو ذہنی تکلیف پہنچانا اور ان کی آمد ورفت کی حوصلہ شکنی کرنا تھا، ویسے اسرائیل نے اس ایمیگریشن پوائنٹ کا نام شاہ حسین مرحوم (سابق فرمانروائے اُردن) کے نام پر رکھا ہے، اور ان کی متعدد تصویریں آویزاں کر رکھی ہیں۔

باہر نکل کر ہم لوگ بس میں بیٹھ گئے، پہلے اسی شہر میں کھانا ہوا؛ کیوں کہ ناشتہ کے بعد ہی سے سارے لوگ بھوکے تھے، یہ شہر بہت سرسبز وشاداب ہے، اوراس کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ بستی چھ ہزار سال قبل مسیح کی ہے، یہ بات بھی نقل کی جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہیں کے ایک پہاڑ کے غار میں چالیس دن گزارے تھے، اور یہیں اندھوں کے بینا ہونے، برص زدہ شخص کے صحت مند ہونے اور مُردوں کے زندہ ہونے کا معجزہ پیش آیا تھا، وہاں سے یہ قافلہ بیت المقدس کی طرف چلا اور تقریباً رات کے دس ساڑھے دس بجے ہم لوگ بیت اللحم میں واقع اس ہوٹل میں پہنچے، جس کا ہم لوگوں کے لئے فلسطین کے گائیڈ نے انتظام کر رکھا تھا، گائیڈ کا نام موسیٰ تھا، یہ انگریزی کے علاوہ بہت واضح عربی میں گفتگو کرتے تھے، معلومات بھی بہتر تھیں، یہ کافی معمر گائیڈ تھے، اوراسرائیلی سیکوریٹی والے ان سے واقف تھے؛ اس لئے آسانی ہوتی تھی۔

۷رجنوری کو ہم لوگ گائیڈ کی ہدایت کے مطابق ناشتہ کر کے ساڑھے آٹھ نو بجے روانہ ہوئے، پہلے ہمیں بیت اللحم میں واقع اس چرچ میں لے جایا گیا، جو عیسائیوں کے نزدیک ان کا سب سے مقدس مقام ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی ہے، یہ ایک پُر رونق پہاڑی پر واقع ہے، جس جگہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش کہا جاتا ہے، وہ کافی گہرا تہہ خانہ ہے، اس کے اوپر علامتی طور پر ایک خوبصورت منڈپ بنا ہوا ہے، جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے مجسمے ہیں، سطح زمین کے اوپر گول دائرے کی شکل میں ایک سوراخ ہے، یہ اتنا بڑا ہے کہ ہاتھ اندر داخل کیا جا سکے، جو عیسائی حضرات آتے ہیں، وہ اسی سوراخ سے اندر دیکھتے ہیں اوراسے بوسہ دیتے ہیں، یا اظہار عقیدت کے لئے پھول یا گڑیا اندر ڈالتے ہیں، ظاہری شکل بالکل سجدہ کی سی ہوتی ہے، وہیں سے ایک دو قدم کے فاصلہ پر ایک اور گہری سی جگہ بنی ہوئی ہے، جسے بچوں کا جھولا کہا جاتا ہے، لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گہوارہ تھا، عیسائی حضرات ان مقامات پر موم بتیاں جلا کر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش اور گہوارہ نشیب میں ہے، اوپر سے سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے پہنچنا ہوتا ہے، باب الداخلہ کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ انسان کافی سر جھکا کر اندر داخل ہو سکے، محسوس ہوا کہ اس طرح قصداً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فرضی شبیہ کے سامنے جھکنے کی ایک شکل پیدا کی گئی ہے۔

اس سے متصل کئی بڑے ہال ہیں، بہت خوبصورت اور دیدہ زیب، ان ہالوں میں آمنے سامنے تین چرچ ہیں، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ہی عمارت؛ بلکہ ایک ہی ہال کے اندر تین چرچ کیوں ہیں؟ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ عیسائیوں کے تین الگ الگ فرقے کیتھولک، پروٹیسٹنٹ اور آرتھوڈکس کے چرچ ہیں، میں نے سوچا کہ لوگ مسلمانوں کے اختلاف کو اس قدر اُبھار کر پیش کرتے ہیں کہ گویا ہر مسلمان دوسرے کے خون کا پیاسا ہے؛ لیکن خود عیسائیوں کا حال یہ ہے کہ ایک ہی جگہ ایک دوسرے کے مدمقابل تین تین چرچ موجود ہیں۔

منزلِ شوق کی طرف

اس کے بعد ہم لوگ مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے، جس کا دیدۂ شوق کو شدت سے انتظار تھا، سیکوریٹی کے سخت انتظام کی وجہ سے خاصے فاصلہ پر واقع شارع عام پر بس سے اُتار دیا گیا اور یہاں سے یہ پورا قافلہ ان پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے مسجد اقصیٰ تک پہنچا، جس کے دونوں طرف دوکانیں ہیں، اور جگہ جگہ غاصب اسرائیل کی سیکوریٹی فورس کے جوان مرد وعورت گن تھامے ہوئے کھڑے ہیں، اور آئے دن فلسطینیوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں، مسجد اقصیٰ کے باب الداخلہ پر ان سیکوریٹی والوں کو اجازت نامہ دکھا کر داخل ہونا پڑتا ہے، گائیڈ کو اپنا لائسنس ان کے پاس رکھ کر جانا ہوتا ہے؛ تاکہ وہ تمام افراد کی واپسی کو یقینی بنائے، سیکوریٹی والوں کے چہروں سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مسلمانوں کے یہاں آنے سے سخت تکدر ہے۔

بیت المقدس ایک فصیل بند شہر ہے، اس کے اندر مسجد اقصیٰ کا احاطہ ہے، جو بتایا گیا کہ ۱۳۶/۱ یکڑ کے قریب ہے، قبلہ کی مخالف سمت سے اگر احاطہ میں داخل ہوا جائے تو سیڑھیوں سے گزرنے کے بعد ایک وسیع وعریض صحن ہے، جو سطح زمین سے کافی بلندی پر واقع ہے، پھر جب آگے بڑھیں تو پہلے قبۃ الصخرۃ سامنے آتا ہے، ''صخرۃ'' کے معنی چٹان کے ہیں، یعنی یہ گنبد اس چٹان پر ہے، جہاں سے رسول اللہ ﷺ کا سفرِ معراج شروع ہوا تھا، اسی کے اوپر وہ خوبصورت سنہرا گنبد ہے، جو دور سے نظر آتا ہے اور جس کو تصویروں میں مسجد اقصیٰ تصور کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس گنبد میں ۲۰۰ رکیلو سونا لگایا گیا ہے، اموی خلیفہ عبد الملک ابن مروان نے ۶۶ھ میں اس کی تعمیر شروع کروائی اور ۷۲ھ میں اس کے بیٹے ولید بن عبد الملک کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی، موجودہ عمارت سلطان عبد الحمید اور سلطان عبد العزیز کی مرمت کے بعد کی ہے، سلطان عبد الحمید ثانی نے اس عمارت کے چاروں طرف سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ یٰسین کی آیات خوبصورت پتھروں پر لکھوائی ہیں، یہ ہشت پہل عمارت ہے، اور ہر پہلو ۶۴ رفٹ لمبا ہے، اس کا قطر ۴۴، ۲۰ میٹر اور بلندی ۳۱ رمیٹر ہے، جس چٹان کی وجہ سے یہ گنبد بنایا گیا، وہ تو اس کے ایک حصہ میں اور تہہ خانہ کے اندر ہے؛ لیکن یہ پوری عمارت ایک مسجد کی شکل میں ہے، جس میں پنج وقتہ نمازیں ہوتی ہیں، پوری مسجد میں خوبصورت قالینیں بچھی ہوئی ہیں، اور نہایت مزین چھت ہے، جو کاریگری کا اعلیٰ نمونہ ہے، ہم لوگوں نے اسی میں ظہر وعصر کی نمازیں ادا کیں۔

قبۃ الصخرۃ کے پیچھے پھر ایک وسیع صحن ہے اور اس کے بعد مسجد اقصیٰ کی عمارت ہے، جس میں سرمئی رنگ کا گنبد ہے، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے فتح بیت المقدس کے موقع سے اس کی تعمیر کرائی تھی، مشہور جغرافیہ داں مقدسی (متوفی: ۹۸۵ھ) نے اس کی لمبائی پندرہ سو فٹ اور چوڑائی ایک ہزار پچاس فٹ لکھی ہے، ۱۹۶۷ء میں

جب اسرائیل نے اس پر غاصبانہ قبضہ کیا تو اس کے چودہ دروازے تھے، اس مسجد میں سات ہزار لوگوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے، رنگین شیشوں سے مزین ۱۲۱ر کھڑکیاں، ۴۵ ر ستون اور ۷ ر ہال ہیں، مسجد کی موجودہ شکل میں ترکوں کا بھی حصہ ہے، اللہ جزائے خیر دے کہ انھوں نے چھتوں پر بڑی ہی دیدہ زیب مینا کاری کی ہے، یہ کئی ہالوں پر مشتمل ہے اور جیسے مسجد نبوی میں ترکوں نے چھوٹے چھوٹے گنبد بنائے ہیں، دونوں کنارے کے ہال ایسے ہی گنبدوں پر مشتمل ہیں، مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اسرائیلی غاصبین مسلسل نیچے کھدائی کر رہے ہیں، مسجد کو آگ بھی لگائی گئی، اور بار ہا اسرائیلی فورسس کی طرف سے حملے بھی ہوئے؛ لیکن اس کے باوجود اس مسجد کے محفوظ رہنے کا ظاہری سبب کیا ہے؟ اس کا اندازہ مسجد کو دیکھ کر ہوتا ہے، اس کی دیواریں اتنی چوڑی اور اس کی بنیادیں اتنی مضبوط ہیں (جس کا اندازہ تہہ خانہ میں اُترنے کے بعد ہوتا ہے) کہ خصوصی منصوبہ بندی کے بغیر اس کو منہدم کرنا دشوار ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور یہودیوں کے شر سے مامون رکھے، یہیں ہم لوگوں نے جماعت کے ساتھ مغرب وعشاء کی نماز ادا کی اور اللہ کی توفیق کے مطابق تمام ساتھیوں نے نماز، تلاوت اور دُعاء کا اہتمام کیا، راقم الحروف نے اپنے ساتھیوں کو مسجد کے ایک گوشہ میں جوڑ کر مسجد اقصیٰ کی فضیلت اور اس میں کئے جانے والے اعمال کے بارے میں ضروری باتیں عرض کیں، مغربی ملکوں سے آئے ہوئے بعض اُردو داں حضرات بھی اس مجلس میں شریک ہوگئے۔

یہ تو دو مسجدیں ہوئیں ''قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ'' جو ہمیں نظر آتی ہیں، اگلے روز ہم لوگ پھر مسجد اقصیٰ آئے تو حقیقی مسجد اقصیٰ جو اُس نظر آنے والی مسجد کے نیچے کافی گہرائی میں بنی ہوئی ہے، اور جس میں صحن سے سیڑھیوں کے ذریعہ پہنچا جاتا ہے، وہاں پہنچنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ بھی بہت بڑی مسجد ہے اور یہ بھی دو تہوں میں ہے، ایک اوپری حصہ ہے اور پھر اس سے نیچے اصل مسجد ہے، اس کے ستون پتھروں کے ہیں، اور گول شکل میں ہیں، اور اتنے چوڑے ہیں کہ اگر ایک آدمی اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو تب بھی وہ ستون کو پکڑ نہ پائے، زمین سے لے کر چھت تک ایک ہی ستون ہے، اس طرح کے چار پانچ ستون بنے ہوئے ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنات نے بنائے تھے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں سے کام لیا کرتے تھے، (النمل: ۳۸-۴۰) اُس دور میں نہ گاڑیاں تھیں، اور نہ وزنی چیزوں کو اوپر چڑھانے کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی، اس وقت انسان کے لئے ایسے پتھر کو تراشنا، انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور ان کے اوپر چھت تعمیر کرنا بظاہر عقل کے باہر ہے، واللہ اعلم۔

اس اصل مسجد اقصیٰ کی سمت قبلہ میں محراب بنی ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ وہ محراب تھی، جہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے نماز پڑھائی اور دُعاء کی تھی، ہم لوگوں نے بھی یہاں چند رکعات نفل ادا کرنے کا شرف حاصل کیا کہ شاید اللہ کے نبی کے نقش قدم کا لمس گنہگار پیشانیوں کے حصہ میں آجائے، دوستوں سے عرض کیا گیا کہ چوں کہ

یہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کے لئے دُعاء مانگی تھی اور ان کی دُعاء قبول کی گئی؛ اس لئے جن حضرات کو اولاد نہ ہو، یا ان کے متعلقین میں کسی کو اولاد نہ ہو تو انھیں یہاں اولاد کے لئے دُعاء کرنی چاہئے، اس کی بائیں جانب تقریباً دوفٹ کی اونچائی پر ایک اور ہال ہے، اس میں ایک کنواں ہے، اس کنویں کی اصل یہ ہے کہ صحابیہٴ رسول حضرت میمونہؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ اگر میں بیت المقدس نہ جاسکوں تو کیا کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیل بھیج دو، جس سے روشنی کا انتظام ہو جائے، وہاں کے لئے تیل بھیجنے والا وہاں جانے والے کی طرح ہے'' (ابن ماجہ، باب ماجاء فی الصلاۃ فی مسجد بیت المقدس)؛ چنانچہ لوگ بیت المقدس کے لئے تیل بھیجا کرتے تھے، اسی سے بیت المقدس میں روشنی کا انتظام ہوتا تھا، اور ۷۰۰ رقندیل جلائی جاتی تھی، یہ تیل اسی کنویں میں ڈال دیا جاتا تھا، آج کل اس پر ایک لوہے کی جالی لگادی گئی ہے، جھانک کر دیکھا جائے تو کوئی سیال چیز نظر آتی ہے، شاید یہ تیل کی بقیات ہوں۔

اس سے اور نیچے دائیں جانب گائیڈ ہم لوگوں کو لے کر گیا اور ایک مقام کا مشاہدہ کرایا، جہاں ایک جھولا نما پتھر رکھا ہوا ہے، بتایا گیا کہ حضرت مریم علیہا السلام نے ولادت کے بعد یہیں توقف کیا تھا، یہیں صرف تین دنوں کی عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گفتگو کی تھی، اور حضرت مریم پر تہمت لگانے والوں سے کہا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھ کو کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے: ''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا'' (مریم: ۳۰) باب الرحمۃ سے ہم لوگ احاطہٴ مسجد میں داخل ہوئے، اور اسی احاطہ سے باہر بھی آئے، راستہ میں بائیں جانب ایک بڑا چبوترہ ہے، جس میں صبرہ اور شتیلا کے وہ مظلوم مرد وعورت اور بچے بوڑھے مدفون ہیں، جن کا خبیث ولعین یہودیوں نے قتل عام کر دیا تھا، یہاں خاص طور پر فاتحہ پڑھنے کا اہتمام کیا گیا، اللہ مظلوم فلسطینیوں کی مدد فرمائے اور ملعون یہودیوں کو کیفر کردار تک پہنچائے، وماذالک علی اللہ بعزیز۔

۸؍جنوری کو ہم لوگ صبح اپنی قیام گاہ سے نکلے اور ایک بار پھر اس راستہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف گئے، جس میں دیوار گریہ واقع ہے، اسی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر یہودی عبادت کرتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے خیال میں تعمیر سلیمانی میں سے صرف یہی دیوار بچی ہوئی ہے، وہ اس کو دُعاء کی قبولیت کی جگہ سمجھتے ہیں، یہ ایک بڑا صحن ہے اور اس کے بیچ میں جالیوں کے ایک طرف مرد کھڑے ہوتے ہیں، اور دوسری طرف عورتیں کھڑی ہوتی ہیں، جو عام طور پر لمبے سیاہ گون میں ہوتی ہیں، عجیب بات ہے کہ جو لوگ پوری دنیا میں عورتوں کی بے قید آزادی کا فتنہ پھیلا رہے ہیں اور مخلوط ماحول کی ترغیب دیتے ہیں، خود ان کے یہاں عبادت میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ رہنے کا تصور بھی ہے، اور اس پر سختی سے عمل بھی، یہ بات دیکھنے کو ملی کہ یہودی عوام بھی اور ان کی فوج اور پولیس کے لوگ بھی عام طور پر داڑھی رکھتے ہیں، اور ان کی مذہبی شخصیتیں — جو ''ربی'' کہلاتی ہیں — کی داڑھی تو سینے سے بھی نیچے تک ہوتی ہے۔

مسجد اقصیٰ سے باہر نکلنے کے بعد ہم لوگ کوہ زیتون پر لے جائے گئے، یہ شہر قدس کی سب سے اونچی پہاڑی ہے، یہاں سے صخرہ کا سنہرا گنبد بے حد خوبصورت نظر آتا ہے، اور نیچے دُور دُور تک زیتون کے ہرے بھرے باغات کا منظر بھی قابل دید ہے، اس پہاڑی کے نشیب میں یہودیوں کا کافی بڑا قبرستان ہے، وہ بھی مسلمانوں کی طرح مُردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں، اسی پہاڑی پر حضرت سلمان فارسیؓ کے نام سے ایک گنبد بنایا گیا ہے؛ لیکن یہ ان کی قبر نہیں ہے؛ بلکہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں کچھ عرصہ انھوں نے قیام فرمایا تھا، اسی کے قریب مسجد رابعہ عدویہ بصریہ واقع ہے، اس سے متصل ان کی قبر ہے، جو ایک غار میں ہے، نقل کیا جاتا ہے کہ وہ یہیں عبادت کیا کرتی تھیں، اور یہیں ان کی وفات ہوئی، فلسطین، اُردن اور مصر میں قبریں عام طور پر غار یا گہرے تہہ خانوں میں ہوتی ہیں اور سطح زمین پر لکڑی وغیرہ کے قبے رکھے ہوتے ہیں، اس کے اوپر چادر ہوتی ہے، اور پھر اوپر پتھر یا آرسی سی کا گنبد تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں قبر ہوتی ہے، اس کو مقبرہ کہتے ہیں، اور جہاں قبر نہیں ہوتی؛ لیکن اس جگہ پر ان بزرگ نے قیام کیا، وہاں یادگار کے طور پر ایک ایسی ہی عمارت بنادی جاتی ہے، اور اسے زیادہ تر ''مقام'' کہتے ہیں۔

حرم ابراہیمی میں

حضرت رابعہ بصریہ کی قبر کی زیارت کے بعد ہم لوگوں کا سفر ''الخلیل'' کی طرف ہوا، جس کو یہودی ''حبرون'' کہتے ہیں، بیت المقدس سے یہاں کا فاصلہ تقریباً دو گھنٹے ڈرائیونگ کا ہے، اس کو حرم ابراہیمی بھی کہتے ہیں؛ کیوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر مبارک یہیں ہے، مقبرہ کا کافی بڑا احاطہ ہے، اور اسی میں وسیع وعریض مسجد بھی ہے، یہ احاطہ قلعہ نما شکل میں پتھر کی دیواروں کا ہے، پہلے مسجد میں دو رکعت نفل ادا کی گئی، پھر سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر پر حاضری ہوئی، اس قبر پر لوہے کی جالی اور گلاس کی دیوار کا احاطہ ہے، ایک جانب جدھر قبر کا زیادہ حصہ ہے، وہ مسلمانوں کے زیر تولیت ہے، اور دوسری طرف یہودی زیارت کرتے ہیں؛ چوں کہ یہاں اکثر مسلمانوں کا یہودیوں سے ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے؛ اس لئے دونوں کے حصے الگ کر دیئے گئے ہیں؛ تاکہ تصادم کی نوبت نہ آئے، اسی مسجد میں حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت رفقہ علیہا السلام کی قبریں ہیں، جو حصہ یہودی غاصبوں کے قبضہ میں ہے اور جس میں مسلمانوں کے جانے پر پابندی ہے، اس میں حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور حضرت یوسف کی والدہ لیّا (علیہم السلام) کی قبریں ہیں، یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی اہلیہ کی قبروں پر، اور جن قبروں پر مسلمانوں کو جانے سے روک دیا گیا ہے، ان پر دور ہی سے فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مسجد خلیل کے ایک طرف مسلم آبادی ہے اور دوسری طرف یہودی آبادی؛ اس لئے برابر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے، یہاں ساری دکانیں بند، سڑکیں ویران اور اسرائیلی فورس کی بڑی تعداد نظر آئی، یہاں سے بیت المقدس

واپس جاتے ہوئے راستہ میں حضرت شمعون علیہ السلام کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، جو بنی اسرائیل میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔

ان زیارتوں سے فارغ ہوکر ہم لوگ مقام ''لُد '' پر گئے، جہاں اس وقت اسرائیلی ایئرپورٹ بنا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس مقام کے بارے میں پیشین گوئی فرمائی ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے، وہیں سے قریب اسرائیل کی راجدھانی تل ابیب ہے، احباب کے اصرار پر بادل ناخواستہ یہاں بھی جانا ہوا، بعض حضرات وہاں سے کچھ خرید وفروخت کرنا چاہتے تھے، اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ شدید اور مسلسل بارش کی وجہ سے بس سے نیچے اُترنے کی بھی نوبت نہیں آئی، تل ابیب میں بعض عرب محلے بھی موجود ہیں، وہاں سے بھی گذر ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو علاقہ اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ سرحد کے مطابق اسرائیل کا حصہ ہے، اسرائیل نے اس کو بہت ترقی دی ہے، جس صحراء میں خاک اُڑتی تھی، وہاں ہرے بھرے باغات ، سرسبز وشاداب کھیت، منصوبہ بندی کے ساتھ بنائی گئی بلند عمارتیں، فور لائین سڑکیں، دومنزلہ میٹروٹرینیں، بہ کثرت کارخانے اور فیکٹریاں نظر آتے ہیں، کھجور کے درختوں کی قطاریں اتنی خوبصورت اور باغات اتنے گھنے ہیں کہ خلیجی ملکوں میں بھی نظر نہیں آتے، غرض کہ اسرائیل کی ترقی قابل رشک ہے، فلسطینی علاقے اگرچہ کہ سرسبز وشاداب ہیں، نیز صفائی ستھرائی اور سڑکوں کے اعتبار سے بھی بہتر ہی ہیں؛ لیکن اسرائیلی علاقہ کے مقابلہ بہت کمتر، اسرائیل سے متصل مصر کے زیر اقتدار صحراء سینا کے علاقہ میں آج بھی خاک اڑتی ہے، اور ترقی کا نام ونشان نہیں، افسوس کہ مسلم ممالک نے مغرب سے علوم وٹکنالوجی خریدنے کی بجائے ان کی تہذیب وثقافت خرید کرلی اور اسی کو بہت بڑی چیز سمجھا۔

مصر کی طرف

۹ /جنوری کو ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا اور ہم لوگوں کے اصرار پر پروگرام سے ہٹ کر گائیڈ نے آمادگی ظاہری کی کہ وہ ہمیں مزید ایک گھنٹہ مسجد اقصیٰ میں عبادت کا موقع دے گا؛ چنانچہ ہم لوگ ناشتہ کے بعد مسجد اقصیٰ کے لئے نکلے، آج گائیڈ ایک مختصر راستہ سے ہمیں مسجد کے اندر لے آئے، ہم لوگ سیدھے مسجد سے نیچے واقع اصل مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور دو گھنٹے وہاں رہ کر حسب توفیق نماز، دُعاء اور ذکر وتلاوت کا اہتمام کیا، چلتے چلتے مسجد اقصیٰ میں عبادت کا جو موقع میسر آ گیا، اس سے سبھوں کو بڑا قلبی سکون حاصل ہوا۔

یہاں سے اب ہم لوگوں کا سفر مصری بارڈر کے طرف شروع ہوا، جو طابہ شہر میں واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ یہی راستہ ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نجات پانے کے بعد گزر کر بیت المقدس کی طرف آئے تھے، اسی راستہ میں سدوم اور عامورہ کے وہ مقامات ہیں، جہاں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی، اللہ کے عذاب کے

طور پر پہلے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی، پھر زمین کوان پر پلٹ دیا گیا، (اعراف:۱۶۰) اسی جگہ آج کل بحر مُردار واقع ہے،اس کے پانی میں ۳۳ فیصد نمک ہے۔

اس علاقہ میں ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے،مگر یہ پہاڑ بہت ہی خوفناک نظر آتے ہیں،اور جیسے چوہے زمین میں بل بناتے اورسوراخ کردیتے ہیں، پہاڑوں میں ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سوراخ نظر آتے ہیں، میں نے رفقاء سفر سے حضرت لوط کی قوم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت دی ہے کہ جب عذاب یافتہ قوموں کے ٹھکانوں سے گزرو تو جلدی نکل جاؤ؛لیکن جب دیکھا کہ بہت سے لوگ اس کے پانی میں تیراکی کا عزم مصمم کئے ہوئے ہیں تو عرض کیا کہ کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اگر آپ یہاں رکیں تو زیادہ سے زیادہ استغفار پڑھنے کا اہتمام کریں،نمک کی کثرت کی وجہ سے چوں کہ اس پانی کا اپنا وزن بہت بڑھا ہوا ہے؛اس لئے جب اس میں کوئی چیز ڈالی جاتی ہے تو وہ ڈوبتی نہیں ہے،اور ایسے لوگ بھی جو تیراکی سے واقف نہیں ہیں،اس طرح پانی کی سطح پر لیٹ جاتے ہیں،گویا وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ہیں،بہرحال بہت سے لوگوں نے یہاں غسل کیا اور پھر یہیں عصر کی نماز پڑھی گئی،عجیب بات ہے کہ قوم لوط پر عذاب کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور تورات میں بھی؛لیکن اب یہاں بڑے شرمناک مناظر نظر آتے ہیں،اسرائیل اور مغرب سے آئی ہوئی بعض عورتیں مختصر؛بلکہ مختصر ترین لباس پہن کر پورے جسم میں سمندر کی مٹیاں مَل کر دوڑ بھاگ کرتی رہتی ہیں؛کیوں کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ اس مٹی کے لگانے سے جلدی امراض سے صحت ہوتی ہے،گویا جوجگہ عبرت حاصل کرنے کی تھی،اب وہ تفریح گاہ ہے۔

یہاں سے گزر کر ہم لوگ سرِشام ''طابہ'' پہنچے،اس ایمیگریشن کا نام سابق اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے نام پر ہے،ہم لوگوں کا خیال تھا کہ اب تو ہم لوگ اسرائیل سے واپس ہو رہے ہیں؛اس لئے وہ خوشی خوشی اور جلدی جلدی ایمیگریشن کی کارروائی کردیں گے،اور اُس طرح پریشان نہیں کیا جائے گا،جیسے اسرائیل میں داخل ہوتے ہوئے کیا گیا تھا؛لیکن جس قوم کی فطرت میں خباثت ہوتی ہے،وہ ہر جگہ اپنا رنگ دکھاتی ہے؛چنانچہ اول تو دور سے سامان اُٹھا کر ایمیگریشن کے احاطہ میں آنا پڑا،پھر سارا سامان اسکرین پر ڈالا گیا،اور حسب معمول لوگوں کی جانچ کی گئی،اس کے بعد دریافت کیا گیا کہ آپ لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں ہے؟ بتایا گیا کہ کوئی ہتھیار نہیں ہے،ساری کارروائی ہوچکی تھی کہ اچانک اِلارم بجا،یہ خطرہ کا الارم تھا،سیکوریٹی گارڈ نے بھاگ دوڑ شروع کر دی،اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی،سبھوں کے ہاتھ میں گن تھے،ہم لوگ ایمیگریشن سے باہر آ گئے تھے؛لیکن ابھی اسرائیلی حدود ہی میں تھے،ہم لوگوں سے کہا گیا کہ آپ فوراً اندر واپس جائیں،ہم لوگ ایک لمبی قطار کی شکل میں کرسیوں پر بٹھا دیئے گئے؛اگرچہ اس کے اوپر ایک سائبان بنا ہوا تھا؛لیکن سخت ٹھنڈک اور تیز ہوا تھی،چاروں طرف سے سیکوریٹی کے لوگ گن تان کر کھڑے ہوگئے،اور کچھ اس طرح گھور کر دیکھنے لگے جیسے سب دہشت گرد بیٹھے

ہوئے ہیں، اور ہتھیار بھی کچھ اس طرح سنبھالے ہوئے تھے کہ گویا خطرناک مجرموں کو انجام تک پہنچانے کے لئے بالکل تیار کھڑے ہیں، گائیڈ نے پہلے ہدایت کردی تھی کہ اسرائیلی ایمیگریشن میں ڈرانے کے لئے نفسیاتی طور پر اس طرح کی حرکت کی جاتی ہے، اگر ایسا ہو تو لوگ بالکل خاموشی سے بیٹھے رہیں؛ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد بغیر کسی تفتیش اور چیکنگ کے ہم لوگوں کو روانہ کر دیا گیا۔

دنیا میں شاید ہی کسی ایمیگریشن میں اتنے بداخلاق اور بدطینت لوگ پائے جاتے ہوں؛ تاہم مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا؛ کیوں کہ جس قوم نے پیغمبروں کے ساتھ یہاں تک کہ خود اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی کی ہو، اس سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

بیت المقدس کے اس سفر سے جو چند تأثرات قائم ہوئے، وہ یہ ہیں :

(۱) فلسطینی مسلمان بے حد مدد کے مستحق ہیں، انھیں بے گھر کیا جا رہا ہے، ان کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتی کی جاتی ہے، حد یہ ہے کہ ہم جس ہوٹل میں مقیم تھے، وہاں سے قریب ایک فلسطینی نوجوان کی دوکان تھی، اس نے بتایا کہ ہم نے زندگی میں ایک ہی بار مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی ہے، ہمیں وہاں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی، وہ دیوار بھی دیکھی، جس نے غزہ کو ایک بڑی جیل میں تبدیل کر دیا ہے، اور اس کے علاوہ بھی جگہ جگہ فلسطینی آبادیوں کو دیواروں سے گھیر دیا گیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ نہ وہ تجارت کر سکتے ہیں نہ ملازمتوں کے دروازے ان پر کھلے ہوئے ہیں، اگر بچے کھچے فلسطینی بھی فلسطین سے باہر نکل جائیں تو اسرائیل کا مقصد پورا ہو جائے گا، اور وہ پوری سرزمین فلسطین پر قابض ہو جائے گا؛ اس لئے پورے عالم کے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے فلسطینی بھائیوں کی مالی مدد بھی کریں اور میڈیا کے ذریعہ بھی ان کی مظلومیت اور اسرائیلیوں کے ظلم وجور کو نمایاں کریں، نیز جو فلسطینی وہاں آباد ہیں، ان کا حوصلہ بڑھائیں، وہ حقیقت میں ملت اسلامیہ کی زمینی سرحد کے محافظین ہیں۔

(۲) اسرائیل چاہتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لئے مسلمان کم سے کم آئیں، بدامنی کے بعض واقعات اگرچہ پیش آتے رہتے ہیں؛ لیکن صورت حال اتنی خراب بھی نہیں ہے کہ وہاں جایا نہیں جاسکے، بیت المقدس کے اندر داخل ہونے کے بعد عبادت کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے؛ اس لئے مسلمانوں کو جرأت سے کام لیتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فلسطین کا سفر کرنا چاہئے اور مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنی چاہئے؛ ورنہ اسرائیل کے اس دعویٰ کو تقویت پہنچے گی کہ چوں کہ مسلمانوں کے پاس مکہ ومدینہ موجود ہے اور بیت المقدس سے ان کا زیادہ تعلق بھی نہیں رہا؛ اس لئے ان کو اب اس سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔

(۳) عالم اسلام کو خصوصاً اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو عموماً اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ منظم طور پر سائنسی علوم میں آگے بڑھیں، اگرچہ کہ اس سلسلہ میں زیادہ اہم کردار مسلم ممالک ہی انجام دے سکتے ہیں؛ تاہم

ہندوستان کے مسلمان بھی اس میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں ؛ کیوں کہ ہندوستان سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں اُبھرتا ہوا ملک ہے، اوراس کی اس صلاحیت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے؛ مگر افسوس کہ اولاً تو ہم تعلیم کے میدان میں پیچھے ہیں، اور جو کچھ حاصل کررہے ہیں، اس میں بھی صرف معاشی پہلو کو سامنے رکھ کر میدان کا انتخاب کرتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ شاذونادر ہی کسی مسلمان کا ملک کے سائنس دانوں میں شمار کیا جاتا ہے، جو لوگ عصری تعلیم کے میدان میں کام کررہے ہیں، ان کو خاص طور سے اس پر توجہ دینی چاہئے۔

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرزمین میں

اُردن اور فلسطین کے بعد ہمارے سفر کی تیسری منزل تھی مصر،فوجی طاقت اور افرادی قوت کے اعتبار سے مصر عالم عرب کا سب سے بڑا ملک ہے، اس کا ایک حصہ ایشیا میں اور دوسرا حصہ شمالی افریقہ میں واقع ہے؛ اگرچہ اس کے پاس پٹرول نہیں ہے؛ لیکن قدرتی گیس سے مالا مال ہے، مصر جانے کے لئے ہم لوگوں نے ’’طابہ‘‘ کا بارڈر پار کیا، یہاں کی ایک مقامی ٹور کمپنی سے ہماری ٹور کمپنی کا معاہدہ تھا، بارڈر پار کرنے کے بعد قریب آدھے گھنٹے کی مسافت پر ایک ریسٹورنٹ میں رات کا قیام اور عشائیہ کا انتظام کیا گیا تھا، یہاں ہمیں جو گائیڈ فراہم کیا گیا، اس کا نام بھی عمرو موسیٰ تھا، یہ کافی واقف گائیڈ تھا، میرے ساتھ خاص کر بہت احترام سے پیش آتا تھا، اور ہمیشہ ’’سیدی وشیخی‘‘ سے مخاطب کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ آپ امیر ہیں، ہم سب مامور ہیں۔

۱۰ر جنوری کی صبح ہم لوگ ’’طابہ‘‘ سے مصر کی راجدھانی ’’قاہرہ‘‘ کی طرف روانہ ہوئے، مصر اُن ملکوں میں ہے جس کی تہذیب بہت قدیم ہے، اس کی تمدنی فتوحات کا اندازہ اہرام مصر سے لگایا جا سکتا ہے، مسلمانوں کا بھی یہاں سے روحانی رشتہ ہے، یہی ملک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریق ہجرت ہے، حضرت ہاجرہ علیہا السلام جن کی مبارک نسل سے رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے، اسی سرزمین سے ان کا تعلق ہے، یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا وہ خوبصورت واقعہ پیش آیا، جس میں عبرت وموعظت کے ڈھیر سارے پہلو موجود ہیں، اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو خوبصورت ترین داستان ’’احسن القصص‘‘ قرار دیا ہے، (یوسف: ۳) حضرت یوسف علیہ السلام یہاں ایک زرخرید غلام کی حیثیت سے لائے گئے، اور مختلف آزمائشوں سے گذر کر اس پورے خطہ کی فرماں روائی کے منصب پر فائز ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اسی سرزمین میں پیدا ہوئے اور یہیں نبوت سے نوازے گئے، اسی خطہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات ہوئی؛ اس لئے ایک مسلمان کے لئے مصر کی سیر کا شائق ہونا فطری بات ہے۔

طابہ سے قاہرہ کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا، اور اس کے بیشتر حصہ میں خشک پہاڑوں اور ریگزاروں کے سوا

دُور دُور تک کوئی چیز نظر نہیں آتی، کہیں کہیں خانہ بدوشوں کی کچھ جھونپڑیاں نظر آجاتی ہیں؛ البتہ جو تاریخی یادگاریں ہیں، وہاں مسافروں اور سیاحوں کی موجودگی زندگی کا احساس دلاتی ہے، بہر حال طابہ سے نکلنے کے بعد ہم لوگوں کی پہلی منزل ''کوہِ طور'' تھی، یہاں پر چاروں طرف چھوٹے بڑے پہاڑ ہیں، جس جگہ ہم لوگ پہنچے، وہاں ایک پہاڑی تھی، اس کو عبور کرنے کے بعد دوسری جانب کوہ طور ہے، یہ کافی بلند پہاڑ ہے، اس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے عام طور پر لوگ رات میں چڑھائی کرتے ہیں اور پانی کی بوتلیں بھی ساتھ رکھتے ہیں، ہمارے قافلے میں بہت سے معذور لوگ تھے اور متعدد خواتین تھیں؛ اس لئے پہاڑ پر چڑھنا ممکن نہیں تھا، اگر کوئی راستہ دیارِ محبوب کی طرف جاتا ہو تو انسان کو وہ بھی محبوب ہوتا ہے؛ اس لئے محبت کی آنکھوں سے دور ہی سے اس مقام کا دیدار کیا گیا۔

یہاں پر ''کیتھرائن'' نامی چرچ ہے، جو ایک راہبہ کا بنایا ہوا ہے، جس نے مصر میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اس ویران جگہ کو اپنی کٹیا بنایا تھا، یہاں بھی ہم لوگوں کو لے جایا گیا، اس میں مسلمانوں کے لئے سبق ہے کہ جو لوگ باطل کے نمائندے ہیں، وہ اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں، اور ہم مسلمان فریضۂ دعوت کی طرف سے کس قدر بے توجہ ہیں! اسی چرچ سے متصل ایک درخت ہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی جگہ سلگتی ہوئی آگ دیکھی تھی اور آگ لینے کے لئے وہاں پہنچے تھے، لوگوں میں مشہور ہے کہ جب بھی یہ درخت سوکھ کر ختم ہونے لگتا ہے، اس کی جڑوں سے نئی کونپلیں نکل آتی ہیں، یہیں آپ علیہ السلام کو نبوت ملی تھی، اس کے بعد صحراء سینا میں ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ اس مقام پر پہنچے، جہاں حضرت ہارون علیہ السلام کا قیام تھا، سڑک کے ایک طرف یہ جگہ ہے اور دوسری طرف وہ جگہ ہے، جہاں ''سامری'' نے سونے کی گائے بنا کر لوگوں کو گاؤ پرستی کی دعوت دی تھی اور بنی اسرائیل کی ایک بڑی تعداد اس گمراہی کا شکار ہوگئی تھی، اس مقام پر پہاڑی سے پتھر کی ایک ایسی شکل لگی ہوئی ہے، جو گائے کا سنگی مجسمہ نظر آتا ہے، مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ نے سامری سے ناراض ہو کر اس کی گائے کو دیوار کی طرف پھینک دیا تھا، اور وہ بچھڑے کی شکل میں پتھر بن کر پہاڑ سے چپک گیا؛ مگر یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی؛ کیوں کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو جلا کر اور ریزہ ریزہ کر کے دریا میں ڈال دیا تھا۔ (طٰہٰ: ۹۷)

یہاں سے ایک طویل سفر کے بعد مغرب کے قریب ہم لوگ اس جگہ اُترے، جس کو ''آبار موسیٰ'' یا ''عیون موسیٰ'' کہتے ہیں، یہ بحر قلزم (جس کو بحر احمر بھی کہا جاتا ہے) کے قریب واقع ہے، غالباً یہی وہ جگہ ہے جہاں سے بحر قلزم کو عبور کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ ''وادیٔ سینا'' میں پہنچے تھے، اور فرعون اپنے لشکر کے ساتھ غرق کر دیا گیا تھا، یہاں آٹھ کنویں ہیں، چند کنویں ہم لوگوں نے دیکھے، جس میں سے دو کنووں میں پانی بھی

موجود ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے پانی کا مطالبہ کیا اور آپ نے دُعاء فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا گیا، آپ نے عصا مارا اور حکم الٰہی سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، کہا جاتا ہے کہ یہ کنویں ان ہی کی باقیات ہیں، یہاں پر قریب میں آبادی بھی ہے، اور متعدد مسجدیں بھی اور دکانیں بھی ہیں؛ چنانچہ یہیں نماز مغرب ادا کی گئی، صحرائے سینا کے اسی طویل علاقہ میں وادیٔ تیہہ واقع ہے، جس میں بنی اسرائیل کو ان کی سرکشیوں کی وجہ سے چالیس سال تک بھٹکتے رہنے کی سزا دی گئی اور اس کھلے صحراء کو ان کے لئے جیل بنا دیا گیا۔

نماز کے بعد آگے کا سفر شروع ہوا، اور قاہرہ کے مضافات میں ''سوئز ٹنل'' سے گذرنے کی نوبت آئی، یہ راستہ نہر سوئز کے نیچے زیر زمین گزرتا ہے، یہاں آکر ٹریفک کا ہجوم ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ مال برداری کے لئے اس نہر کی بڑی اہمیت ہے، اس کے ایک طرف ایشیاء کا علاقہ ہے اور دوسری طرف افریقہ کا، مصر کے لئے نہر سوئز کی بڑی اہمیت ہے، اور یہ مصر کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے، یہ خوبصورت اور روشن سرنگ نما راستہ ہے، نہر سوئز پار کرنے کے بعد ہم لوگ قاہرہ میں داخل ہوگئے، پھر بھی اپنی منزل تک پہنچنے میں ڈیڑھ تا دو گھنٹے کا وقت لگ گیا، گزرتے ہوئے دریائے نیل سے بھی گزر رہوا، قاہرہ فلک بوس میناروں اور خوبصورت گنبدوں کا شہر ہے، قدم قدم پر مسجدیں ہیں، مختلف بادشاہوں نے اپنے اپنے دور اقتدار میں خوبصورت مسجدیں تعمیر کرکے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کی ہے، ترقی کے اعتبار سے مصر ہندوستان کے مقابلہ کمتر درجہ کا ملک ہے، سڑکیں بھی اچھی نہیں ہیں، صفائی ستھرائی کے اعتبار سے برا حال ہے، اکثر مقامات پر سرِراہ کچڑوں کا انبار ہے، کھلے ہوئے گندے نالے بیچ راستہ سے گزرتے ہیں، چوں کہ قاہرہ بھی بنیادی طور پر ریگستان ہی کا علاقہ تھا؛ اس لئے گرد وغبار کی بہتات ہے، بہرحال ہم لوگ رات کے نو دس بجے اپنے ہوٹل پہنچے، جو ہمارے لئے مصری گائیڈ نے کرایہ پر لے رکھا تھا، اور دن بھر کی صحرانوردی نے کچھ اس طرح تھکا دیا تھا کہ تمام شرکائے سفر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اگلا دن قاہرہ کے تاریخی مقامات کی سیر کے لئے تھا؛ چنانچہ ناشتہ کے بعد سب سے پہلے ہم لوگوں کو اہرام مصر لے جایا گیا، ''اہرم'' کے معنی پرانی عمارت کے ہیں، غالباً اسی قدامت کی وجہ سے اس کو اہرام کہا جاتا ہے، یہ مخروطی طرز کی عمارتیں ہیں، جو مصری بادشاہوں کے مقبرے کے طور پر تعمیر ہوئی ہیں، کہا جاتا ہے کہ مصر میں بحیثیت مجموعی ایک سو اڑتیس (۱۳۸) اہرام ہیں، تین اہرام قاہرہ کے مضافات میں ہیں، ان میں سے بڑے اہرام کو دنیا کے سات عجائب میں شمار کیا گیا ہے، انیسویں صدی سے پہلے ۴۳ صدیوں تک یہ دنیا کی سب سے اونچی عمارت تھی، اس کی بلندی ۴۵۵ فٹ ہے، اور اس کا رقبہ ۱۳ ایکڑ ہے، اس کو ۲۵ لاکھ پتھر کے بڑے بلاکس سے تعمیر کیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک کا وزن ۲۵ سے ۲۸ ٹن تک ہے، مصر کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا: ''فرعون'' اس اہرام میں ''خوفو'' نامی فرعون مدفون ہے، ہوتا یہ تھا کہ بادشاہ کی لاش کو ممی کرکے اس کے زیورات، لباس، برتن، ہتھیار یہاں

تک کہ کبھی کبھی جانور، غلام اور باندیوں کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا، اس اہرام کے ساتھ ۳/اور چھوٹے اہرام بھی ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ اس کی ۳/بیویوں کے ہیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ ان اہراموں کی تعمیر ۲۳/سو سال قبل مسیح عمل میں آئی تھی، یہ انسان کے لئے جائے عبرت ہے کہ جن لوگوں نے ایسی کوہ ہیکل عمارتیں بنائیں، آج وہ سامان عبرت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں، ہلکی دھوپ اور قابل برداشت خنک ہواؤں کی وجہ سے ماحول بہت خوشگوار تھا، بہت سے لوگ اونٹ اور گھوڑے پر بیٹھ کر اہرام کے دامن میں تصویریں کھنچوار ہے تھے۔

اہرام مصر کی سیر کے بعد ہم لوگ قاہرہ کے مشہور میوزیم کو گئے، جس میں بہت سی چیزوں کے بشمول فراعنہ مصر کی لاشیں بھی تھیں، اسی میں ایک لاش اُس فرعون کی ہے، جس کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پیش آیا، مفسرین نے اس کا نام ''رَعمیس'' بتایا ہے، یہ تمام لاشیں ممی کی ہوئی ہیں، ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس فرعون کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم تمہارے بدن کو محفوظ اور سالم رکھیں گے اور تم کو پوری دنیا کے لئے نشان عبرت بنادیں گے، (یونس: ۹۲) شاید اسی لئے اِس فرعون کی لاش زیادہ بہتر حالت میں ہے، اس کی لاش دوسری لاشوں کے مقابلہ نسبتاً لمبی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دوسری لاشوں میں رگیں سکڑ گئی ہوں اور ان کا قد چھوٹا پڑ گیا ہو، اور اس فرعون کی لاش کو من جانب اللہ اس سے بچایا گیا ہو، دوسرے: حضرت موسیٰ علیہ السلام والے اِس فرعون کی پیشانی مکمل سیاہ نہیں ہے؛ بلکہ پیشانی کے اوپری حصہ کا رنگ سانولا ہے، اور سر کے بال بڑے بڑے ہیں، اس کے برخلاف دوسری لاشیں بالکل سیاہ ہوگئی ہیں، اور ان کے سر پر یا تو بال ہیں ہی نہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت تھوڑے۔

آج جمعہ کا دن تھا؛ اس لئے ہم لوگ میوزیم سے نکلنے کے بعد قاہرہ کی مشہور مسجد مسجد محمد علی کو گئے، یہ مسجد پوری طرح ترکی کی ''مسجد ازرق'' کے ڈیزائن پر ہے، اگر کوئی شخص اس مسجد کی صرف تصویر دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ استنبول کی مسجد ازرق ہی ہے، اور چوں کہ یہ ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے؛ اس لئے اس کے بلند مینارے اور خوبصورت گنبد دور سے نظر آتے ہیں، مسجد کے اندر کی بناوٹ بھی بالکل استنبول ہی کی مسجد ازرق کی طرح ہے، بلند چھت، چھوٹے چھوٹے گنبدوں کو جوڑتے ہوئے بڑا گنبد، گنبدوں اور چھتوں پر خوبصورت کشیدہ کاری؛ لیکن نقل اور اصل کا فرق پوری طرح واضح ہے، یہ مسجد اُس قلعہ کے اندر ہے جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے تعمیر کرایا تھا، ۵۷۲ھ میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا، اور ۵۷۸ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، یہ جبل مقطّم نامی پہاڑ پر تعمیر کیا گیا ہے، صلاح الدین ایوبی نے اس قلعہ میں سطح زمین سے نوے میٹر گہرا کنواں بھی کھدوایا تھا؛ تاکہ اگر قلعہ کا محاصرہ ہو جائے تو پانی دستیاب رہے، بہر حال یہ قلعہ بھی دیکھنے کے لائق ہے، قلعہ کی چھت پر چڑھا جائے تو سامنے ایک ایسی مسجد نظر آتی ہے، جس کے چار حصے ہیں، معلوم ہوا کہ پچھلے ادوار میں یہاں اسی طرح مسجدیں تعمیر کی جاتی تھیں، اور فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کے لئے الگ الگ گوشے ہوتے تھے۔

مصر کی زراعت کے لئے شروع سے دریائے نیل کی بڑی اہمیت رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے طویل دریا ہے، جس کی لمبائی ۶۶۹۵ کیلومیٹر ہے، یہ ایتھوپیا سے نکل کر سوڈان ہوتے ہوئے مصر پہنچتا ہے، اور دوسری طرف بحیرۂ روم میں جا کر گرتا ہے، اس پر جوڈیم بنایا گیا ہے، اس سے بننے والی جھیل ۵۵۰ رکیلومیٹر لمبی اور ۳۵ رکیلومیٹر چوڑی ہے، اس کا ۸۳ رفیصد حصہ مصر میں اور ۱۷ رفیصد حصہ سوڈان میں واقع ہے، دارالحکومت قاہرہ اور مصر کے اکثر شہر اسی دریا کے کنارے پر واقع ہیں؛ کیوں کہ مصر کے اتھاہ صحراء میں پانی کا کوئی اور قابل ذکر ذریعہ نہیں ہے، اس دریا کا ذکر حدیث میں بھی آیا ہے، اور اسے جنت کے دریاؤں میں شمار کیا گیا ہے، (بخاری، حدیث نمبر:۳۲۰۷) اس دریا سے مسلمانوں کی بھی ایک تاریخ وابستہ ہے، مصر کا پانی ہر سال ایک خاص زمانہ میں رُک جاتا تھا، اور دریا کو منانے کے لئے کسی کنواری لڑکی کو سنوار کر خشک دریا میں بٹھا دیا جاتا تھا، پھر پانی اُبلنے لگتا تھا، اس طرح ہر سال ایک لڑکی کی قربانی دی جاتی تھی، جب فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کی تشریف آوری کے بعد یہ بات پیش آئی تو وہ حضرت عمرؓ کو خط لکھ کر مشورہ کے طلب گار ہوئے کہ نیل خشک ہو چکا ہے، اب اس سلسلہ میں کیا کیا جائے؟ حضرت عمرؓ نے اس جاہلانہ رسم سے منع کر دیا، اور دریائے نیل کے نام خط لکھا کہ اگر تو حکم خداوندی سے جاری تھا تو جاری ہو جا؛ ورنہ رُکا رہ؛ چنانچہ دریا جاری ہو گیا، (کنز العمال:۱۲/۵۶۱) اور آج تک جاری ہے۔

یوں تو آتے جاتے کئی بار اس دریا پر بنے ہوئے پُل سے گزرنے کا موقع ملا؛ لیکن آج مصر کے میزبان نے دریائے نیل کے اندر ہی اسٹیمر میں عشائیہ کا انتظام رکھا تھا، ہم لوگ مغرب کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد دریائے نیل کے ساحل پر لے جائے گئے، پہلے سے اسٹیمر میں جگہ بُک تھی، تھوڑی دیر میں اسٹیمر روانہ ہوا اور کھانا کھایا گیا، یہ بہت ہی دلکش منظر تھا، دریائے نیل کا پانی کافی صاف وشفاف ہے، ہمارے ہندوستان میں بڑے بڑے دریاؤں کا بھی دامن سکڑ گیا ہے، اور برسات کے سوا وہ ایک بڑے نالہ یا چھوٹی نہر کی طرح ہو جاتا ہے؛ لیکن دریائے نیل کی چوڑائی بھی اچھی خاصی ہے، افسوس کہ مصر نے مغربی تہذیب کو کچھ اس طرح اپنے لئے آئیڈیل بنالیا ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی مسلم ملک میں ہیں یا مذہبی قدروں سے آزاد مغربی ملک میں؟ ظاہر ہے کہ ایک باضمیر مسلمان جب اس صورت حال کو دیکھتا ہے تو اسے غیر معمولی کڑھن ہوتی ہے، یہاں بھی کچھ ایسے مناظر سامنے آئے کہ طبیعت بے چین ہو گئی، باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا؛ اس لئے اسٹیمر کے عرشہ پر پناہ لینی پڑی، پہلے میں جناب احمد قادری صاحب (کریم نگر) کو لے کر اوپر گیا، پھر ہمارے قافلہ کے تمام رفقاء یکے بعد دیگرے اوپر آ گئے، یہاں اگرچہ ٹھنڈی ہواؤں سے لوگ ٹھٹھر رہے تھے؛ لیکن وہاں سے دریا اور اس کے کناروں کا منظر بہت خوبصورت لگ رہا تھا، اور چوں کہ ٹھنڈک سے بچنے کے لئے سبھی حضرات گرم لباس سے مسلح تھے؛ اس لئے اس ٹھنڈک کا مقابلہ ممکن ہو سکا، دو گھنٹے دریا کی سیر کرنے کے بعد ہم لوگ نیچے اُترے اور ہوٹل واپس آ گئے۔

چند ساعتیں — اسکندریہ میں

قاہرہ کے بعد مصر کا دوسرا بڑا شہر ''اسکندریہ'' ہے، آئندہ دن صبح میں جلد ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ یہاں کے لئے روانہ ہوئے، کہا جاتا ہے کہ ۳۳۴ قبل مسیح میں یہ شہر آباد ہوا، اس شہر کو مشہور فرمانروا اور فاتح سکندر اعظم نے بسایا تھا، ایک زمانہ میں اس شہر کے اندر روشن مینار (لائٹ ہاؤس) بنا ہوا تھا، جس کو دنیا کے عجائب میں شمار کیا جاتا تھا؛ لیکن وہ ایک زلزلہ میں زمیں بوس ہوگیا، یہاں زمانۂ قدیم میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا، جو کتب خانہ اسکندریہ کے نام سے مشہور تھا، مستشرقین نے مسلمانوں پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے اس کتب خانہ کو نذر آتش کر دیا اور اس کو مسلمانوں کی علم دشمنی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؛ لیکن یہ الزام غلط ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے مدلل طور پر تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے۔ (کتب خانہ اسکندریہ، طبع: ۱۹۰۲، مطبع مفید عام)

یہ مصر کا بندرگاہی شہر ہے، اور یہیں اس کی سب سے بڑی بندرگاہ قائم ہے؛ کیوں کہ یہاں سے ایشیا، یوروپ اور افریقہ تینوں براعظم بہت تھوڑے فاصلہ پر ہیں؛ اس لئے راہداری کے اعتبار سے اس شہر کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تیل اور قدرتی گیس کی پائپ لائنیں یہیں سے گزرتی ہیں؛ اس لئے یہ مصر کا ایک اہم صنعتی مرکز ہے، مسلمانوں نے ۱۴/ ماہ کے محاصرہ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کے زیر قیادت ۶۴۱ھ میں اس شہر کو فتح کیا تھا؛ لیکن رومیوں کے بحری بیڑے نے دوبارہ اس پر قبضہ کرلیا، بالآخر مسلمانوں نے اگلے ہی سال دوبارہ اسے واپس لینے میں کامیابی حاصل کی، کتب خانہ اسکندریہ بھی اسی جنگ کے دوران رومیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

کئی حادثات سے دوچار ہونے اور تباہی و بربادی سے گزرنے کے بعد ۱۸۱۰ء میں مصر کے عثمانی گورنر محمد علی پاشا نے شہر کو دوبارہ تعمیر کرنا شروع کیا، اور ۱۸۵۰ء تک اس کی رونقیں بحال ہو پائیں، ہم لوگ ۱۲/ جنوری کو حسب معمول ناشتہ کے بعد اسکندریہ کے لئے نکلے اور تقریباً چار ساڑھے چار گھنٹے میں اسکندریہ پہنچے، یہ بحر احمر کے ساحل پر واقع ہے، اور ساحل کا منظر بہت خوبصورت ہے، ساحل پر ایک بڑا قلعہ بھی ہے، چوں کہ یہ شہر ہمیشہ رومیوں کے حملوں کی زد میں رہتا تھا، اس سے محفوظ رکھنے کے لئے مسلمانوں نے اس قلعہ کی تعمیر کی تھی، یہ کافی مضبوط قلعہ ہے، جس کی دیواروں سے سمندر کی لہریں ٹکراتی رہتی ہیں، ساحل سمندر کے قریب ہی ایک مسجد میں ہم لوگوں نے ظہر وعصر کی نمازیں ادا کیں، اس محلے سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم ہندوستان کے کسی بڑے شہر کے قدیم محلے میں ہیں، یہاں کتب خانوں کی بڑی تعداد ہے؛ بلکہ جس مسجد میں ہم لوگوں نے نماز ادا کی، اس کے راستہ میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک دورویہ عمارتیں ہیں، جو زیادہ تر بک ڈپو ہیں، اور ان میں نئی مطبوعات کے علاوہ قدیم کتابیں بھی دستیاب ہیں۔

یہاں ہم لوگوں کو قصیدہ بُردہ کے مصنف امام بوصیریؒ (محمد بن سعید بن حماد: ۶۰۸-۶۹۶) کی قبر کی زیارت کا موقع ملا، آپ کی وجہ شہرت قصیدہ بُردہ ہے، یہ قصیدہ عالم اسلام کے ہر گوشے اور خطے میں پڑھا اور سنا جاتا ہے، جس طرح یہ قصیدہ نعت رسول پاک میں لاجواب اور بے مثل ہے، اس قصیدہ کا محرک اور باعث بھی اتنا ہی ایمان افروز اور عشق رسول کے جذبات کو موجزن اور متلاطم کردینے والا ہے، امام بوصیری کہتے ہیں کہ میں نے رسول پاک ﷺ کی شان میں چند قصائد لکھے تھے کہ اسی دوران مجھ پر فالج کا حملہ ہوا اور نیچے سے نصف بدن مفلوج ہو گیا، اس حادثہ کے بعد بھی میں آپ ﷺ کی نعت کہنے کی فکر میں ہی مستغرق تھا کہ یہ قصیدہ تیار ہو گیا، میں نے اسی قصیدہ کے وسیلہ سے اللہ سے صحت کے لئے دُعاء کی، اور سو گیا، میں خواب میں حضور پاک ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوا، آپ ﷺ نے میرے چہرہ پر اپنا دست مبارک پھیرا، مجھ پر اپنی چادر ڈال دی، پھر جب میں بیدار ہوا تو پوری طرح سے صحت مند تھا، اور فالج کے مرض کا دُور دُور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا؛ چوں کہ آپ ﷺ نے امام بوصیری پر اپنی چادر ڈال دی تھی اور عربی میں چادر کو بُردہ کہتے ہیں، اسی وجہ سے یہ قصیدہ ''قصیدہ بُردہ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اسی جگہ ان کے استاذ شیخ ابوالعباس مرسیؒ کی قبر بھی ہے، اور یہیں پر ان کے نام سے بنی ہوئی مرسی مسجد بھی ہے، ان کے علاوہ حضرت دانیال نبی علیہ السلام اور حکیم لقمانؒ کی قبروں کی زیارت کا بھی موقع ملا، حکیم لقمان کو بعض لوگوں نے نبی قرار دیا ہے؛ لیکن زیادہ تر اہل علم نے ان کو ولی قرار دیا ہے نہ کہ نبی، اسکندریہ کو نسبتاً مصر کا سستا شہر مانا جاتا ہے؛ اسی لئے گائیڈ نے وہاں لوگوں کو کچھ خرید وفروخت کے لئے بھی وقت دیا، اور شرکاء سفر نے اپنے اپنے منشاء کے مطابق خریداریاں کیں، بہر حال رات کے تقریباً ۱۰ ربجے ہم لوگ قاہرہ میں اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔

واپسی کا دن

۱۳ رجنوری ہم لوگوں کی مصر سے واپسی کی تاریخ تھی، جامعہ ازہر کے کچھ طلبہ جو ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، کا بار بار فون آ رہا تھا کہ جامعہ میں زیر تعلیم ہندوستانی طلبہ ملاقات کے خواہاں ہیں؛ چنانچہ ناشتہ سے پہلے ہی عزیزی مولوی محمد ایمن ظفر، مولوی فضل الرحمٰن ازہری، اور مولوی مکرم علی سلمہم اللہ تعالیٰ اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ہوٹل پہنچ گئے، انھوں نے کہا کہ قافلہ کے لوگوں کو جانے دیں اور آپ ہم لوگوں کے ساتھ آ جائیں، جب یہ قافلہ جامع ازہر کی زیارت کے لئے آئے گا تو ہم لوگ اس کے ساتھ شامل ہو جائیں گے، یا سیدھے آپ کو لے کر ایئرپورٹ پہنچ جائیں گے، مجھے بھی اس تجویز سے بڑی خوشی ہوئی، مولوی ایمن ظفر سلمہ دارالعلوم مئو کے فارغ ہیں، اور کچھ عرصہ ان کا قیام میرے ساتھ حیدرآباد میں بھی رہا ہے، اس وقت جامعہ ازہر سے اُصولِ فقہ میں ماسٹر کر رہے ہیں، مولوی فضل الرحمٰن پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، اور وہاں کے شعبۂ معہد اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین میں خدمت بھی انجام دے

رہے ہیں، ان کے والد مرحوم جامعہ رحمانی مونگیر میں میرے ہم عصر تھے، اور مولوی مکرم علی سلمہ میرے دوست مولانا ظفیر علی عمری صاحب (حال مقیم امریکہ وسابق استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) کے عزیز ہیں، مولوی عبدالاحد رحمانی جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے فقہ میں تخصص کر چکے ہیں، وہ بھی اس وقت یہیں زیر تعلیم ہیں؛ چنانچہ میں ان عزیزوں کے ساتھ روانہ ہوا، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں کم وقت میں بہت سارے بزرگوں کی قبروں کی زیارت کا شرف حاصل ہوگیا۔

ہم لوگ ہوٹل سے سیدھے جامع عمرو ابن العاصؓ پہنچے، یہ براعظم افریقہ میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد ہے، مسجد کے ایک گوشے میں مکتبہ ہے، جو دراصل حضرت عبداللہ ابن عمر ابن العاصؓ کا مقبرہ ہے، جن کو صحابہ میں بہ کثرت روایتِ احادیث کا امتیاز حاصل تھا، پھر حضرت مسلمہ بن مخلدؓ کی مسجد جانے کی سعادت حاصل ہوئی، اسی مسجد سے متصل ان کی قبر مبارک بھی ہے، صحابہ کی قبروں میں حضرت عقبہ بن عامرؓ کی قبر پر بھی جانے کا موقع ملا، اس سے متصل بھی ایک بڑی مسجد ہے، اسی مسجد کے ایک کونہ میں چھوٹی سی قبر ہے، جس کا زیادہ تر حصہ زیرِ دیوار ہے، یہ حضرت عمرو بن عاصؓ کی قبر ہے، معلوم ہوا کہ اہل تشیع کے خوف سے ان کی قبر کو چھپا کر رکھا گیا ہے؛ کیوں کہ وہ قبروں کے ساتھ بدسلوکی کیا کرتے ہیں، **اللّٰھم اھدھم الصراط المستقیم۔**

کربلا کے کرب کے بعد جب اہل بیت اطہار کو بنواُمیہ کے ظالم اور خبیث سپاہی قیدی بنا کر دمشق لے گئے، تو بہت سے اہل بیت وہاں سے مصر چلے گئے؛ اسی لئے قاہرہ میں متعدد اہل بیت بزرگوں کی قبریں موجود ہیں، اور زائرین وہاں بکثرت آتے رہتے ہیں؛ چنانچہ اہل بیت میں سے حضرت زینب بنت حسینؓ اور امام محمد جعفر صادقؒ کی صاحبزادی سیدہ عائشہؒ یہیں آسودۂ خواب ہیں، اور ان کی قبروں کے ساتھ عظیم الشان مسجدیں بنی ہوئی ہیں، محمد ابن حنفیہؒ کی قبر بھی یہیں ہے، جو حضرت علیؓ کے صاحبزادۂ گرامی قدر ہیں، اور حضرت علیؓ کی دوسری اہلیہ خولہ بنت جعفر بن قیس الحنفیہ کے بطن سے ہیں، جمل اور صفین کی جنگوں میں اپنے والد گرامی کے ساتھ شریک اور علَم بردار رہے، یہیں اہل بیت کی ایک خاتون سیدہ نفیسہؒ بنت حسن بن زید ابلج بن حسن بن ابی طالب (۱۱؍ربیع الاول: ۱۴۵ھ - رمضان: ۲۰۸ھ) کی بھی قبر ہے، آپ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں، بچپن ہی سے علم کا شوق تھا اور لوگ خاندانی نسبت اور علمی وجاہت کی وجہ سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

جامع ازہر کے سامنے مسجد حسینؓ ہے، غالباً معتبر طور پر تو یہ بات ثابت نہیں؛ لیکن بعض حضرات کا دعویٰ ہے کہ حضرت حسین کا سر مبارک...... جو بنواُمیہ کے غارتگر نیزے پر اُٹھا کر دمشق لائے تھے...... بعد میں وہ دمشق سے قاہرہ لایا گیا، اور فاطمی دور حکومت میں اسی جگہ سرِ مبارک کی تدفین عمل میں آئی، (واللہ اعلم) اس سے متصل بہت ہی خوبصورت اور وسیع مسجد ''جامع حسینؓ'' کے نام سے ہے، جہاں زائرین کا بڑا اژدہام ہوتا ہے، یہ جگہ اس درجہ مشہور

اور زیارت گاہ عام وخاص ہے کہ اگر عام ٹیکسی والوں سے جامع ازہر چلنے کو کہا جائے تو ان کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے؛ لیکن جامع حسین سے ہر عام وخاص واقف ہیں، راقم الحروف نے دیکھا کہ یہاں زائرین کی بڑی تعداد بوہرہ فرقہ کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

جیسے بغداد ایک زمانہ میں اہل علم کا مرکز تھا، اسی طرح بغداد کی تباہی کے بعد قاہرہ اہل علم کا مرکز بن گیا تھا اور بڑے بڑے فقہاء، محدثین، صوفیاء اسی خطہ میں خیمہ زن ہوئے تھے، ان ہی میں حضرت امام شافعیؒ ہیں، جو حجاز سے عراق اور پھر عراق سے مصر پہنچے، اور یہیں سے ان کا چشمۂ فیض جاری ہوا، ان کی قبر پر بھی حاضری کی سعادت ہوئی، ایک بڑے فقیہ مجتہد امام لیث ابن سعدؒ تھے، جو مصر ہی کے رہنے والے تھے اور جن کے بارے میں امام شافعیؒ کہا کرتے تھے کہ یہ امام مالک سے بڑھ کر فقیہ ہیں؛ لیکن ان کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا، یعنی ان کے علوم جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا، ان کی قبر پر بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، ان کے مقبرہ کا احاطہ کافی وسیع ہے، کئی محدثین بھی اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں، ان ہی میں علامہ زیلعی حنفیؒ، بخاری کے شارحین علامہ بدرالدین عینیؒ، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور علامہ قسطلانیؒ بھی شامل ہیں، علامہ عینی اور علامہ قسطلانی کی قبریں ایک ہی عمارت میں ہیں، اسی میں اس جگہ کو بھی محفوظ وممتاز رکھا گیا ہے، جہاں علامہ عینیؒ کا درس ہوا کرتا تھا، جب کہ حافظ ابن حجرؒ کا درس جامع ازہر میں ہوا کرتا تھا۔

کاروان صوفیاء کے سرخیل ذوالنون مصریؒ کی قبر بھی یہیں ہے، یہاں بھی حاضری کی سعادت ہوئی، یہاں ایک مقبرہ پر رابعہ بصریہ عدویہ کا نام بھی لکھا گیا ہے، اور اہل مصر کا دعویٰ ہے کہ یہی ان کی قبر ہے؛ لیکن ہم لوگوں کو فلسطین میں بھی ایک ایسی قبر کی زیارت کا موقع ملا تھا، جو حضرت رابعہ بصریہ کی طرف منسوب ہے، (واللہ اعلم) معلوم ہوا کہ یہیں صاحب جلالین علامہ جلال الدین سیوطیؒ بھی آسودۂ خاک ہیں؛ حالاں کہ میں بہت تھک چکا تھا؛ لیکن میں نے کہا کہ علامہ سیوطیؒ ہم لوگوں کے براہ راست محسن ہیں؛ کیوں کہ ان کی تفسیر جلالین پڑھی بھی ہے اور پڑھائی بھی ہے؛ اس لئے مجھے بہر قیمت ان کی قبر تک پہنچنا ہے؛ چنانچہ وہاں بھی فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مصری حکمرانوں میں ابن طولون کی بنائی ہوئی مسجد قابل دید ہے اور افریقی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے، مصر میں عام طور پر سمت قبلہ میں نماز کی صفیں ہوتی ہیں، بقیہ تین طرف سے برآمدے ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم مسجد نبوی میں دیکھتے ہیں، یہ مسجد بھی اسی طرز پر ہے، یہاں بھی حاضری ہوئی، اسی طرح قاہرہ کی مشہور مسجدوں میں مسجد سلطان اور مسجد رفاعی کے سامنے سے بھی گزرنے کا موقع ملا۔

قاہرہ کا قبرستان ایک انوکھا قبرستان ہے، جو بہت بڑے حصہ میں پھیلا ہوا ہے، قبرستان میں ہر خاندان نے اپنی جگہ محفوظ کر لی ہے، اور نہ صرف اس کی احاطہ بندی کر رکھی ہے؛ بلکہ اکثر احاطوں کو مکان کی شکل دے دی گئی ہے،

معلوم ہوا کہ اس میں تہہ خانے بنے ہوئے ہیں، اسی کے اندر لاش رکھ دی جاتی ہے، اور بعض مقبرے تو ایسے بھی ہیں کہ اسی میں صاحب خانہ بھی رہتے بھی ہیں، اور مردے کی بھی تدفین ہوتی ہے، پورا علاقہ ابتر حالت میں ہے، اور کچی سڑکوں پر مشتمل ہے، صفائی ستھرائی کی بھی بہت کمی ہے، اتفاق سے اس دن موسم بھی خراب تھا، ابر چھایا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، اس کی وجہ سے بہت دشواری پیش آرہی تھی، کچھ دور تو ٹیکسی گئی؛ لیکن جب ٹیکسی کا راستہ نہ رہا تو وہاں سے ازہر کے طلبہ نے آٹو فراہم کرنے کی کوشش کی، وہاں زیادہ تر آٹو ہندوستان ہی کے سپلائی کئے ہوئے ہیں، اور اس کو'' ٹک ٹک ہندی'' کہا جاتا ہے، پھر جہاں آٹو نے ساتھ چھوڑ دیا، وہاں سے پیدل راستہ طے کیا گیا، اس طرح تکان تو بہت ہوگئی؛ لیکن جن بزرگوں کی قبر پر حاضری کا موقع ملا، ان کی نسبت سے زبردست روحانی مسرت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور آخرت میں بھی ان کے قدموں میں جگہ مل جائے۔

جامعہ ازہر میں

جامع ازہر دراصل ایک عظیم الشان مسجد ہے، جس کی بنیاد فاطمی حکمراں معزالدین باللہ کے حکم سے رکھی گئی تھی، ۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۳۵۹ھ کو اس کی بنیاد پڑی اور ۷؍ رمضان المبارک ۳۶۱ھ میں اس کا افتتاح ہوا، اس مسجد کا نام پہلے ''مسجد القاہرہ'' تھا، پھر جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی نسبت سے اس کا نام جامع ازہر پڑ گیا، مذکورہ فاطمی فرماں روا نے اعلان کر دیا کہ یہ سرکاری مسجد ہوگی، اور یہاں سے شیعہ مذہب کی اشاعت عمل میں آئے گی، پھر دینی علوم کے ساتھ ساتھ وہاں طب، فلکیات اور دیگر علوم کی تعلیم بھی ہونے لگی، تقریباً ۲۰۰؍ سال یہ مسجد شیعی افکار کی تعلیم واشاعت کا مرکز بنی رہی، یہاں تک کہ ۱۱۷۱ء میں صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں میں مصر کی قیادت آئی تو آپ نے طلبہ واساتذہ کے لئے بڑے اوقاف جاری کئے اور یہ مسجد اہل سنت والجماعت کے افکار وعقائد کی اشاعت کا مرکز بن گئی، یہاں سے بڑے بڑے علماء، فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے، جن میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، علامہ بدرالدین عینیؒ، علامہ سخاویؒ، علامہ سیوطیؒ، علامہ ابن خلدونؒ اور بعد کے لوگوں میں علامہ جمال الدین افغانیؒ وغیرہ شامل ہیں۔

مملوکوں کے دور یعنی آٹھویں نویں صدی ہجری کو جامع ازہر کے عروج کا دور سمجھا جاتا ہے، اُس وقت یہاں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ علم الادویہ، ریاضی، فلکیات، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، پھر سلطنت عثمانیہ نے اپنے گراں قدر عطیات کے ذریعہ اس کو ایک خودمختار ادارہ بنا دیا، اور شیخ الازہر کے منصب کو اہل مصر کے لئے مخصوص کر دیا، اس کے بعد شیخ محمد عبدہ کے عہد میں جامع ازہر کے نظام میں جوہری تبدیلیاں ہوئیں، ۱۹۳۰ء میں اسلامی وعربی علوم کو تین شعبوں میں تقسیم کر کے تین کالج قائم کئے گئے: کلیۃ اصول الدین، کلیۃ الشریعۃ اور کلیۃ اللغۃ العربیۃ، پھر ۱۹۶۱ء میں سرکاری فرمان کے تحت دیگر عصری علوم کے شعبے قائم ہوئے، اب جامع ازہر دنیا کی قدیم

ترین اور عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے، جس میں آٹھ لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں، اور سو سے زیادہ ملکوں سے تعلق رکھنے والے ۵۰ ؍ ہزار غیر ملکی طلبہ ہیں۔

اگرچہ اب جامع ازہر ''جامعہ ازہر'' بن چکا ہے، اس کے کالج دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں؛ لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ حکومت مصر نے مسجد کی تعلیم کا قدیم نظام ابھی بھی باقی رکھا ہے، ابھی بھی اس وسیع وعریض مسجد کے مختلف گوشوں میں مختلف اساتذہ الگ الگ مضامین اور کتابوں کا درس دیتے رہتے ہیں، جو طالب علم جس درس میں شرکت کرنا چاہتا ہے، اس میں شریک ہوتا ہے، اور تکمیل پر اس کی سند بھی دی جاتی ہے، اسی میں ایک حلقہ خواتین کی تعلیم کے لئے بھی ہے، بجا طور پر مصر کے لوگوں کو اس ادارہ پر ناز ہے، وہ اس کو بہت تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور شیخ الجامعہ ''امام'' یا ''امام اکبر'' کہلاتے ہیں، عام طور پر مصر اور اس کے پڑوسی ملکوں میں ازہر کے فضلاء ہی دینی خدمتیں انجام دیتے ہیں؛ مگر افسوس کہ مغربی ممالک کے دباؤ کی وجہ سے مصری حکومت جامعہ ازہر پر دباؤ ڈال رہی ہے اور جامعہ ازہر نے اپنے نصاب سے وہ تمام چیزیں نکال دی ہیں، جن کو مغرب نے نکالنے کا حکم دیا ہے، جیسے: آیات جہاد اور اہل کتاب سے متعلق آیتیں، اس سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مقرر کئے ہوئے اِس اُصول کی حکمت واہمیت سمجھ میں آتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو سرکاری امداد سے دُور رکھا جائے۔

ہندوستان کے جو طلبہ جامع ازہر میں مقیم ہیں، ان کا اصرار تھا کہ کچھ وقت ان کے لئے رکھا جائے، اور بقول ان کے کچھ نصیحت کی جائے؛ چنانچہ مسجد کے ایک گوشہ میں ان طلبہ کے ساتھ بیٹھ گیا، اور بروقت جو باتیں ذہن میں آئیں، وہ عرض کی گئیں، اول یہ کہ علماء کہیں بھی جائیں، اپنی شناخت قائم رکھیں، اور اپنی زندگی کے لئے اختلافی مسائل میں اس نقطۂ نظر کو اختیار کریں، جو شک وشبہ سے بالاتر ہو، اور جو اس عہد کے صالحین کے طریقۂ کار سے ہم آہنگ ہو، میں نے مثال دی کہ جیسے مصر کے بیشتر علماء نے بعض شوافع کے ایک شاذ قول کو بنیاد بنا کر کہا کہ داڑھی سنن عادیہ میں سے ہے نہ کہ سنن شرعیہ میں سے، یعنی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا داڑھی رکھنا عربوں کے قدیم عرف کی بناء پر تھا نہ کہ حکم شرعی کی بناء پر، یہ ایک شاذ قول ہے، خود فقہاء شوافع نے بھی اس پر فتویٰ نہیں دیا؛ لیکن مصر وشام کے علماء نے عمومی طور پر اس قول کو اختیار کر لیا، ظاہر ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی واضح ہدایات اور سلف صالحین کے متوارث عمل کے خلاف ہے، جب یہودی ربّیوں اور قبطی عیسائی پادریوں کے ساتھ علماء اسلام کی تصویریں آتی ہیں تو ہم جیسے لوگوں کو بڑا قلق ہوتا ہے کہ دوسرے مذہبی رہنماؤں کی تو بھرپور داڑھیاں ہیں اور ہمارے علماء کا چہرہ صاف ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ مصر سے اسلامی علوم کی سوغات لے کر واپس ہوں؛ لیکن مرعوبیت پر مبنی طرز عمل کو نہ خود اختیار کریں اور نہ اس کو لے کر اُمت کے درمیان جائیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آپ کی فکر میں اعتدال ہونا چاہئے، نہ یہ بات درست ہے کہ مغرب سے جو

کچھ آئے آنکھ بند کر کے اسے قبول کر لیا جائے اور دین کو پیمانہ بنانے کی بجائے اپنی یا سماج کی چاہت کو پیمانہ بنا کر اسلام کو اس کے سانچے میں ڈھالا جائے، اور نہ یہ درست ہے کہ مسلک کو دین کا اور اپنے مکتب فقہ کو شریعت کا درجہ دے دیا جائے، اور اس کے ایک ایک حرف پر اصرار کیا جائے، توازن اور اعتدال ضروری ہے، علماء اگر اعتدال سے محروم ہو جائیں تو اس کا اثر دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، اگر سہولت پسندی میں غلو ہو تو راہ صواب سے انحراف، اور بے جا شدت ہو تو دین سے نفرت۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ عالم کو علم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ دینی غیرت وحمیت کا حامل بھی ہونا چاہئے، یہ اس خشیت کا اولین تقاضہ ہے، جس کو قرآن مجید نے علماء کا وصف قرار دیا ہے: ''اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا'' (سورۂ فاطر:۲۸) چنانچہ ہندوستان میں ہمارے بزرگوں نے جو ادارے قائم کئے، ان میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ ان مدارس سے جو لوگ پیدا ہوں، ان کے پاس صرف معلومات کا ذخیرہ نہ ہو؛ بلکہ دین کے لئے مَر مٹنے کا جذبہ بھی ہو، اسی جذبہ کے تحت ہندوستان میں جب بھی ارتداد کا فتنہ اُٹھا، علماء اس کے مقابلہ کے لئے کمر بستہ ہو گئے؛ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ وقت کی نزاکت کے لحاظ سے وقتی طور پر مدرسہ کی خدمت موقوف کر کے انھوں نے اسلام کے تحفظ کو اپنی مہم بنا لیا، اگر یہ نہ ہوتا تو عیسائیت، آریہ سماجیت، قادیانیت اور انکار حدیث وغیرہ کا فتنہ جس شد و مد کے ساتھ اُٹھا تھا، وہ عمومی طور پر مسلمانوں کو ارتداد و گمراہی کے فتنہ میں بہالے جاتا؛ اس لئے علماء کو ہر قیمت پر اس جذبہ کو باقی رکھنا چاہئے۔

بہر حال جامع ازہر کی اس مختصر سی نشست کے بعد میں باہر نکلا تو ایک طرف کتب خانوں کی ٹھیک اسی طرح قطار تھی، جیسی دیوبند میں یا لاہور کے اُردو بازار میں نظر آتی ہے، اسی طرح تنگ سڑکوں کے دونوں طرف دوکانوں کی قطاریں، اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ بھی اسی انداز کی تھی، جیسے جامع مسجد دہلی کے پاس ہوتی ہے، ویسے بھی معیار زندگی میں مصر اور ہندوستان کے درمیان کافی مماثلت نظر آتی ہے، شارع عام کے علاوہ پتلی سڑکیں ہیں؛ بلکہ بعض جگہ تو سڑکیں گلیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں، عمارتیں بھی زیادہ تر سادہ قسم کی ہیں، ہندوستان میں بہت سے شہروں میں لوگ دیواروں کو پلاسٹر کے بغیر چھوڑ دیتے ہیں، مصر میں بھی یہ منظر کثرت سے نظر آتا ہے، صفائی ستھرائی کا نظام بھی ناقص ہے، ہندوستان میں تو شہروں کے اندر کچی سڑکیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں؛ لیکن قاہرہ جیسے شہر میں بھی اندرونی علاقوں میں بکثرت کچی سڑکیں اور کھلے ہوئے نالے پائے جاتے ہیں، عام طور پر عرب ملکوں میں حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے خوردنی اشیاء ڈھک کر رکھی جاتی ہیں؛ لیکن یہاں برصغیر ہی کی طرح کھلے ہوئے سامان بیچنے اور سرراہ کھانے کی اشیاء کے تلنے کا عام رواج نظر آیا، گاڑیاں بھی ہندوستان کے مقابلہ کم درجہ کی ہیں، کاریں اور ٹیکسیاں عام طور پر غبار آلود نظر آتی ہیں، لگتا ہے کہ یہاں عام لوگوں میں بھی صفائی ستھرائی کا اہتمام کم ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب

حکومت کی لا پرواہی اور عوام کی بے شعوری و بے توجہی کا نتیجہ ہے، خاص کر موجودہ حکومت کے آنے کے بعد سے وہاں کی معاشی ترقی تھم سی گئی ہے، مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے، اور جہاں ایک امریکی ڈالر چار مصری پاؤنڈ کے برابر ہوا کرتا تھا، اب اٹھارہ مصری پاؤنڈ کے برابر ہوتا ہے۔

جامع ازہر کی اس مختصر زیارت نے تشنگی اور بڑھا دی؛ لیکن نظام سفر طے تھا اور آج ہی ہم لوگوں کی واپسی کی فلائٹ تھی؛ اس لئے اس تمنا کے ساتھ رخصت ہوا کہ کوئی سفر خاص طور پر مصر کا کیا جائے؛ تا کہ اس اہم مسلم ملک کے تعلیمی اور مذہبی اداروں کو قریب سے دیکھا جا سکے، جامعہ ازہر کے نظام تعلیم وتربیت کو سمجھا جائے اور یہاں کے تاریخی مقامات پر تفصیلی نظر ڈالنے کا موقع ملے، بہر حال ہمارا قافلہ وہاں سے نکل کر راستہ میں ایک جگہ کھانے کے لئے اُترا، جب سے ہم لوگ مصر پہنچے تھے، احباب کو آج ہی کا کھانا سب سے زیادہ پسند آیا؛ ورنہ ان ملکوں کا بے مسالہ اور اُبالا ہوا کھانا اور سالن لوگ بہ مشکل حلق سے اُتارتے تھے، ہم لوگ تیز تیز قاہرہ ایئر پورٹ پہنچے، قاہرہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ عصری سہولتوں سے آراستہ صاف ستھرا ایئر پورٹ ہے، اور ایئر پورٹ پر نماز ادا کرنے کے لئے مخصوص جگہ کی سہولت بھی رکھی گئی ہے، رات کے تقریباً گیارہ بجے جب ہماری فلائٹ روانہ ہوئی اور جہاز سے قاہرہ پر نظر ڈالی تو شہر کی وسعت اور بے شمار بجلی کے چراغ بڑا اچھا منظر پیش کر رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ دُور دُور تک جگنو اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔

سیاسی صورت حال بہت نا گفتہ بہ ہے، لوگوں کی زبان پر ایسے قفل ڈال دیئے گئے ہیں کہ لوگ تنہائی میں بھی حکومت کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنے سے ڈرتے ہیں، ان ملکوں میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک بدرجہا بہتر ہے، یہاں اظہار رائے کی، مذہب پر عمل کرنے کی، حکومت کی غلطیوں پر ٹوکنے اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کی جو آزادی ہے، ان ملکوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ عالم اسلام اور عالم عرب میں سب سے بڑھ کر قائدانہ صلاحیت مصر کے اندر ہے، علماء مصر کی یہ لیاقت ہر اس شخص کے سامنے نمایاں طور پر آتی ہے، جو عالم اسلام یا عالم عرب کی کسی نمائندہ مجلس میں پہنچے، اور مختلف علماء کے خطابات اور مناقشات کو ملاحظہ کرے، مصر کی حکومت تو مذہب بیزار اور مغرب کے سامنے سربسجود ہے؛ لیکن عوام کے اندر اگرچہ عملی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں، مگر عمومی طور پر ان کے اندر اسلام سے محبت اور شعائر اسلامی کی عظمت ہے، وہ بڑے ادب کے ساتھ علماء سے ملتے ہیں، مجھے بھی بار بار اس کا تجربہ ہوا، اسی طرح حکومت اگرچہ اسرائیل کی دوست ہے اور اس نے مسلم ملکوں سے بڑھ کر اسرائیل سے اپنا تعلق رکھا ہے؛ لیکن عوام کو اسرائیل سے سخت نفرت ہے، یہاں کی فرعونی حکومت نے تو الاخوان المسلمون پر بہت ہی بے جا پابندیاں لگا رکھی ہیں، ان کے رہنماؤں کو پسِ دیوارِ زنداں کر قید رکھا ہے، اور ایک منتخب حکومت کو معزول

کر کے اپنا تسلط قائم کرلیا ہے؛ لیکن دینی جذبہ رکھنے والے عوام، تعلیم یافتہ لوگ اور دین پسند حضرات پر آج بھی اِخوان کا بہت اثر ہے، وہ مرسی کے مختصر دور کو ایک سنہرا دور باور کرتے ہیں، اور واقعہ ہے کہ عالم اسلام کو اخوان جیسی جماعت کی ضرورت ہے، جو تشدد سے بچتے ہوئے پُر امن اور جمہوری طریقہ پر اعتدال کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کو لانے کی کوشش کرے؛ البتہ ہوسکتا ہے کہ حالات کے تقاضوں کے تحت طریقۂ کار میں کسی قدر تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جائے۔

اس بات کو دیکھ کر افسوس ہوا کہ حالاں کہ قاہرہ میں ہر طرف مسجد کے بلند مینارے نظر آتے ہیں اور بڑی عظیم الشان اور وسیع وعریض، خوبصورت مسجدیں ہیں؛ لیکن :

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

عام طور پر نمازیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے، بے اعتنائی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسجدوں میں نہ صرف کرسیوں کی بہتات ہے؛ بلکہ آخری صفوں میں کئی لائنیں طویل بینچوں کی ہیں، جب نماز ہوتی ہے تو ایک ڈیڑھ صف امام کے قریب ہوتی ہے، درمیان میں پوری مسجد خالی رہتی ہے اور کچھ لوگ بالکل آخر میں بینچ پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں؛ اگرچہ مسجد کے اندر اس خلاء کے باوجود نماز درست ہوجاتی ہے؛ لیکن ظاہر ہے کہ معمولاً ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں، اور اس سے نماز کے سلسلہ میں لوگوں کی بے اہتمامی ظاہر ہوتی ہے۔

اسی طرح جہاں شہر کے قدیم محلوں میں باقاعدہ برقعہ پوش خواتین نظر آتی ہیں، وہیں نئے شہر میں صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب کا فتنہ مصر میں اپنے قدم مضبوط کررہا ہے؛ بلکہ کرچکا ہے، اور حکومت اس کو تقویت پہنچارہی ہے، مغربی سازش کا ایک حصہ یہ ہے کہ مصر کو اسلامی تاریخ سے کاٹ کر فراعنہ کی تاریخ سے جوڑا جارہا ہے، فرعون کے نام سے دوکانیں ہیں، مختلف چیزیں فرعون کی تصویر کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں، فرعون کے مجسمے نصب کئے گئے ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ فرعون سے نفرت کرنے کی بجائے اس کو اپنے لئے آئیڈیل اور وجہ وقار تصور کرتے ہیں، جو قوم اپنی تاریخ، اپنی نمائندہ شخصیتوں اور قابل تقلید قیادتوں سے کٹ جاتی ہے، وہ آہستہ آہستہ اپنی فکر سے بھی محروم ہوجاتی ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے، اور عجیب بدبختی ہے کہ ترکوں کے زوال کے بعد سے محمد مرسی کے مختصر دور کو چھوڑ کر اس ملک پر مسلسل فرعون صفت حکمرانوں کا اقتدار قائم ہے، اور اس تسلسل نے وہاں کے اسلامی تشخص کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، والی اللہ المشتکی۔

اللہ تعالیٰ اس صورت حال سے پورے عالم اسلام خصوصاً عالم عرب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

● ● ●

خبر نامہ
المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد

مولانا عبید اختر رحمانی ☆

☆ ۹/جنوری ۲۰۱۹ء، مطابق ۲/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ کو معہد کے شعبہ انگریزی کے استاذ وصدر شعبہ جناب مولانا ناظر انور قاسمی نے ''تین سطحی ہندوستانی نظام حکومت کی ساخت اور اختیارات'' کے عنوان پر محاضرہ دیا، جس میں ہندوستان کے نظام حکومت کو تفصیل سے پیش کیا گیا۔

☆ ۱۶/جنوری ۲۰۱۹ء، مطابق ۹/جمادی الاولیٰ کو معہد کے استاذ اور معتمد تعلیمات حضرت مولانا مفتی شاہد علی قاسمی صاحب کا ''ہندو مذہب اور جین مذہب'' کے اہم عنوان پر محاضرہ ہوا، جس میں آپ نے ان دونوں مذاہب کی تاریخ، نمایاں شخصیات اور افکار کا تعارف کرایا۔

☆ ۲۳/جنوری ۲۰۱۹ء، مطابق ۱۶/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ کو قادیانیت وشکیلیت ۔تحلیل وتجزیہ کے اہم موضوع پر معہد کے استاذ اور اور مجلس ختم تحفظ ختم نبوت تلنگانہ کے ذمہ دار مولانا انصار اللہ قاسمی کا محاضرہ ہوا۔

☆ ۳۰/جنوری ۲۰۱۹ء، مطابق ۲۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ کو معہد کے استاذ اور صدر شعبہ تاہیل القیادۃ مولانا نوشاد اختر ندوی نے ''ماسونیت اور فری میسن تحریک ۔تحلیل وتجزیہ'' کے اہم موضوع پر معہد کے طلبہ کے سامنے اس موضوع سے متعلق حقائق اور نکات پیش کئے، یہ محاضرہ شعبہ ثقافت المعہد العالی الاسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔

☆ ۲/مارچ ۲۰۱۹ء، مطابق یکم رجب المرجب ۱۴۴۰ھ کو معہد کے نائب ناظم و استاذ مولانا مفتی محمد عمر عابدین قاسمی مدنی نے ''مشہور مجامع فقہیہ: تعارف، تاریخ، اہم فیصلے اور نمایاں خدمات'' کے اہم عنوان پر طلباء کو محاضرہ دیا۔

☆ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد۔

☆ ۶ / مارچ ۲۰۱۹ء، مطابق ۲۸ / جمادی الاخری ۱۴۴۰ھ کو معہد اور مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ کے استاذ مولانا مفتی احمد نور عینی قاسمی نے ''دارالعلوم دیوبند ودارالعلوم ندوۃ العلماء : تعارف ، تاریخ ، نمایاں خصوصیات وخدمات'' کے موضوع پر طلباء کے سامنے اپنے مطالعہ کے منتخب نکات پیش کئے۔

☆ ۱۲ / مارچ ۲۰۱۹ء، مطابق ۴ / رجب المرجب ۱۴۴۰ھ معہد کے استاذ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کا ''مقاصد شریعت : تعارف اور تاریخ'' کے موضوع پر محاضرہ ہوا، جس میں مقاصد شریعت کے موضوع کی اہمیت، اور اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی تاریخ بھی بیان کی گئی۔

☆ ۱۳ / مارچ ۲۰۱۹ء، مطابق ۵ / رجب المرجب ۱۴۴۰ھ کو معہد کے استاذ اور معتمد اُمور انتظامی حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے ملک کے اہم تحریکی ادارے ''جمعیۃ علماء ہند: تعارف، تاریخ اور نمایاں کارنامے'' کے موضوع پر محاضرہ دیا، جس میں جمعیۃ کے تاریخ کے ان گوشوں کو بھی منکشف کیا جس سے عام طور پر بے خبری رہتی ہے۔

☆ ۲۵ – تا ۲۹ / مارچ ۲۰۱۹ء، مطابق ۱۷ تا ۲۱ / رجب المرجب المعہد العالی الاسلامی میں سال دوم کے تخصص کے فقہ، دعوۃ، انگلش ڈپلوما اور شعبہ قیادت کے طلبہ کا امتحان منعقد ہوا۔

☆ ۱۳ – ۱۸ / اپریل ۲۰۱۹ء، مطابق ۷ تا ۱۲ / شعبان المعظم المعہد العالی الاسلامی کے سال اول کے متعدد شعبہ جات، تفسیر وحدیث، فقہ، مطالعہ مذاہب، وغیرہ کے امتحانات منعقد ہوئے، جن میں طلبہ نے پوری تیاری کے ساتھ حصہ لیا۔

☆ امسال معہد میں طلبہ کی علمی وفکری صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے ایک نیا طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا کہ فکری مسائل اور فقہی مسائل کے عنوان سے دو گروپ بنائے گئے، فقہی مسائل میں عصر حاضر کے نئے مسائل اور ان کے شرعی جوابات پر مشتمل کتابوں کا طلبہ کو مطالعہ کرنے کے لئے کہا گیا اور اسی طرح عصر حاضری کے فکری مسائل پر منتخب کتب طلبہ کے لئے مطالعہ کے لئے رکھی گئیں اور پھر دونوں موضوعات پر طلبہ کا امتحان لیا گیا، اور کامیاب طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا۔

☆ مؤرخہ: ۲۹ / رجب المرجب ۱۴۴۰ھ، مطابق ۶ / اپریل ۲۰۱۹ء، بروز ہفتہ بعد نماز مغرب معہد کے احاطہ میں معہد کا ۱۸ / رواں جلسہ تقسیم اسناد اور تکمیل درس بخاری شریف منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ناظم المعہد العالی الاسلامی نے کی ، حضرت مولانا شاہد حسنی صاحب (استاذ حدیث وامین عام مدرسہ مظاہر العلوم) نے معہد کے زیر نگرانی چلنے والے مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ کے طلبہ دورۂ حدیث کو بخاری شریف کی

آخری حدیث کا درس دیا، اس اجلاس میں خانوادۂ نانوتوی کے چشم و چراغ حضرت مولانا سفیان قاسمی صاحب بھی بطور مہمان خصوصی موجود تھے، آپ نے اہم اور وقیع خطاب فرمایا، حضرت مولانا شاہ جمال الرحمٰن صاحب (صدر دینی مدارس بورڈ) نے بھی حاضرین سے موثر خطاب کیا، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے دورۂ حدیث اور تکمیل و تخصص کے طلباء کو اپنی سند حدیث — جو کم واسطوں پر مشتمل ہے — اور مسلسلات کی اجازت مرحمت کی، اس اجلاس میں شہر کے علماء، مشائخ اور معززین شریک تھے۔

☆ ۹/اپریل ۲۰۱۹ء، مطابق ۱۰/شعبان کو معہد کے پارک میں ایک مختصر لیکن مؤثر اور مفید اجلاس بعنوان ''دینی مدارس — کارگزاری اور مشورے'' کا انعقاد ہوا، جس میں معہد کے طلباء نے معہد میں حاصل تربیت کا اظہار کیا، اس پروگرام کی صدارت حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بانی و ناظم المعہد العالی الاسلامی نے کی، اس پروگرام میں معہد کے شعبہ تربیت قیادت اور ڈپلوما ان انگلش کے طلباء نے عصری موضوعات پر پاور پوائنٹ کی مدد سے گرافکس تیار کر کے خطاب کیا، اس موقع پر مولوی ارشد ظہیر (فقہ اول) کے طالب علم نے اسلام کے اقتصادی نظام پر انگریزی میں، مولوی خان حبیب الرحمٰن (شعبہ قیادت) نے آر ایس ایس ایک تشدد پسند تنظیم پر اُردو میں، مولوی عادل اسد (مطالعہ مذاہب) نے الیکشن اور ووٹ کی شرعی حیثیت پر اُردو میں، مولوی اورنگ زیب (شعبہ ڈپلوما ان انگلش) نے مذبح خانوں پر سرسری نظر پر انگلش میں، مولوی راشد عابد نے تین طلاق اور اسلام پر، انگریزی میں، مولوی محمد عادل ڈپلوما ان انگلش نے جہاد اور اسلام کے موضوع پر انگریزی میں، مولوی شاہد اقبال (مطالعہ مذاہب) نے تعدد ازدواج کے موضوع پر انگریزی میں اور شعبہ قیادت کے مولوی سہیل احمد ندوی نے ہندو میرتیج ایکٹ پر اُردو میں خطاب کیا ہے، اس موقع پر شہر سے تشریف لائے معززین محمد جعفر صاحب، ضیاء الدین نیر صاحب، ڈاکٹر فخر الدین صاحب، ڈاکٹر افتخار صاحب، عبد اللطیف خان صاحب، خلیل احمد صاحب اور ڈاکٹر یوسف اعظمی وغیرہ موجود تھے، ان سب حضرات نے اس پروگرام اور طلباء کے علمی مظاہرہ پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا اور مزید بہتر کی اُمید جتائی، پروگرام کی نظامت انگلش میں ہی معہد کے فقہ اول کے طالب علم مولوی ارشد ظہیر نے کی، پروگرام میں معہد کے تمام اساتذہ اور طلبہ بھی موجود تھے۔

• • •

شمارہ نمبر: ۱۱۵-۱۱۶، جنوری — جون ۲۰۱۹ء

معہد کی نو توسیع شدہ مسجد جو قریب التکمیل ہے

AL MAHAD UL AALI AL ISLAMI, HYDERABAD

Taleemabad, Quba Colony, P.O. Pahadi Sharif, Hyderabad, 500 005 (T. S.) INDIA.
+91 9959642747
ksrahmani@yahoo.com www.khalidrahmani.com

Al- Alam Urdu Computers Hyd. +91 9959897621

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946